عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۴۱ء

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

(دورِ جدید)

مرتّب

آخوندزادہ حسین امام

جلد ۴ شمارہ ۸

بدل اشتراک پانچ روپیہ سالانہ

ششماہی تین روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

رجب ۱۳۶۰ھ = اگست ۱۹۴۱ء

فہرستِ مضامین

		صفحہ
لمعات	ادارہ	۱ - ۸
کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟	از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۹ - ۴۷
اشتہار		۴۸
رومی نطشے اور اقبال	جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب	۴۹ - ۶۵
مآلِ تہذیب	جناب اسد ملتانی	۶۶ - ۶۷
خلق تقدیر - کتاب اللہ	جناب مشتاق احمد صاحب افغان فاضل دیوبند	۶۸ - ۸۰

لمعات

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا ١٦/٩٢

تمہاری مثال اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر (خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے وقائع و حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی مساعی اور جد و جہد کی تاریخ پر غور کیجئے وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل کے لئے قسم قسم کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت اس کے تمام حسین تصورات کی مرکز۔ اس کی آرزوؤں کی محور اور اس کی تمناؤں کی آماجگاہ بنتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کیلئے آیۂ رحمت ہے جو ان کے عدمِ سکون کی آگ کو تسکین و طمانیت کی جنت سے بدل دیگا۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں مگن، اس قصر رفیع المنزلت کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے اور جوں جوں اس کی دیواریں اوپر کو ابھرتی ہیں اس کی مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ لیکن وہ عمارت ابھی تکمیل کو بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھ سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان خود اپنے ہاتھوں سے اس عمارت کو زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین و جمیل مرقع خاک کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش کو آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کیلئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا، مصر اور یونان۔ چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے۔ اور پہچانئے کہ وہ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدنوں کے بھیانک مدفن ہیں۔ پہچانئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ سطحِ بین

نگاہوں نے ان تعمیرات کو ابھرتے دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ اس قدر محکم اور پائیدار ہیں کہ حوادثِ زمانہ کا کوئی طوفان انھیں متزلزل نہیں کر سکتا۔ لیکن حقیقت بین نگاہوں نے ان کے ابھرنے کے ساتھ ہی محسوس کر لیا کہ یہ عمارتیں خود اپنے بوجھ سے نیچے آ گریں گی اس لئے کہ ان کی بنیادیں بڑی کمزور تھیں۔ یہ وہ عمارتیں تھیں جو ہر دیکھنے والے کو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس لئے کہ جس تمدن کی بنیادیں خدا مستی و خود آگاہی پر نہیں وہ دنیا میں کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی تعمیر میں تخریب اور آبادی میں ویرانی کے آثار موجود ہوتے ہیں انسان کی بے بصری یہ ہے کہ وہ اپنے ذوق کی دھن میں تخریب اور ویرانی کے ان آثار کو نہیں دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ میری ہر کوشش نتیجہ خیز اور ہر اسکیم کامیاب ہو رہی ہے۔

ادوارِ سابقہ کی طرح عہدِ حاضرہ نے بھی ایک تمدن کی عمارت کھڑی کرنی شروع کی۔ جس کی چمک نے کروڑوں آنکھوں میں خیرگی اور جس کی رفعت نے لاکھوں دلوں میں ہول پیدا کر دیا۔ حسب معمول سطح بین انسانوں نے خیال کرنا شروع کر دیا کہ بس اب وہ آخری منزل معلوم ہو گئی جو انسانیت کی معراج ہے اور اس جنت کا پتہ پالیا جو نوعِ انسانی کی تمام کاوشوں اور پریشانیوں کو سبدل بطمانیت کر دیگی۔ حقیقت رس نگاہوں نے اس کی تعمیر میں بھی تخریب کے وہی آثار دیکھے جو اس سے پیشتر سیکڑوں عمارات میں نظر آتے تھے۔ انھوں نے پکار پکار کر اعلان بھی کیا لیکن شوکت و دارائی کے نشہ میں سنتا کون تھا لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا کہ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ اس خدا فراموش نظام کے معماروں نے خود اپنے ہاتھوں سے کس طرح اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کی تفصیل ان خبروں سے معلوم کیجئے جو ہر روز انہی کے پیغامبروں کی وساطت سے دنیا کے بعید ترین گوشوں تک پہنچ رہی ہیں۔ سب سے آخری خبریں روس سے آ رہی ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ جس شہر کے متعلق خطرہ ہوتا ہے کہ دشمن کے ہاتھ آ جائیگا وہاں کے متعلق حکومت کا حکم ہوتا ہے کہ شہر کے باشندے خود اپنے ہاتھوں سے شہر کو آگ لگا کر تباہ کر دیں اور خود شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ "اپنی آبادیوں کو اپنے ہاتھوں سے ویرانوں میں تبدیل کرنا"۔ اُف کس قدر عبرت آموز نقشہ ہے اور کیسی محسوس تفسیر اس آیۂ جلیلہ کی جو ان سطور کی زیب عنوان ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اب انسانیت کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا یہ کشت و خون اور سلب و نہب سکراتِ موت کی

آخری ہچکیاں ہیں یا ایک عملی جراحی ہے جس سے فاسد مادوں کے استیصال کے بعد انسانیت کی رگوں میں صالح خون دوڑا دیا جائیگا۔ اس سوال کا جواب دُنیا اپنی اپنی عقل سے کچھ ہی دے۔ لیکن جس کی نگاہ قرآن کریم پر ہے وہ تو اپنے پورے حزم و یقین کے ساتھ کہدیگا کہ یہ انسانیت کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اور قدم اُٹھ رہا ہے اس منزل کی طرف جو تمدنِ انسانیت کی معراج ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ خدائی نظام کو دنیا میں بھیجا اس لئے گیا ہے کہ وہ تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب آکر رہے (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ) سو جب تک اس نظامِ خداوندی کا غلبہ نہیں ہوگا، کتابِ کائنات کا یہ باب ختم نہیں ہوگا حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کے مادی ارتقاء کی آخری کڑی۔ انسان۔ اس لئے نہیں بنائی گئی کہ انسانیت تجربہ کرتے کرتے ختم ہی ہو جائے۔ ہر تجربہ انسان کو اپنے بنائے ہوئے نظام کی خرابیوں سے آگاہ کرکے اس سے اعلیٰ نظام کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسانیت کی تکمیل ہو نہیں سکتی جب تک وہ اعلیٰ و ارفع نظام انسانی زندگی پر مسلط نہیں ہو جاتا۔ اس نظام کے بعد انسانیت وہ ارتقائی منازل طے کریگی جس کے بعد وہ اس دنیا کی زندگی سے اگلی زندگی (حیاتِ اُخری) بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیگی۔ اُس وقت یہ باب اُلٹ دیا جائیگا۔ اس سے پہلے نہیں۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف اشارہ کیا ہے جب فرمایا۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ۱۰۳/۱–۳

زمانہ اس پر شاہد ہے کہ انسان یقیناً ناکام رہنے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے اور انھوں نے اعمالِ صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے ہیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ انسان نے جو نظام بھی خود وضع کیا اس کا انجام ناکامیوں اور نامرادیوں کے تلخ تجارب کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ کیا کامیابی اور کامرانی کی بھی کوئی صورت ہے؟ جواب ملا کہ یقیناً ہے۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ وہ نظامِ زندگی نافذ ہو جس کی بنیادیں ایمان پر مستحکم ہوں اور جس کی تعمیر اعمالِ صالح اور حق و استقامت کی باہمی تلقین کے اجزاء پر مشتمل ہو۔ یہاں پہنچکر انسان کی ناکامیابیاں، کامیابیوں میں اور نامرادیاں بہرہ مندیوں میں بدل جائینگی یہ نظام قائم ہو کر رہیگا کہ قرآن کو دنیا میں محفوظ رکھا ہی اس غرض کے لئے گیا ہے۔ اس نظام کے علی الوجہ البصیرت تمام نظامہائے انسانی پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان ایک ایک نظام کو اپنے ہاتھوں سے بنائے اور خود ہی

دھاگہ۔ دن بھر سوت کاتے اور شام کو خود ہی کھیر دے۔ جب انسان خود آزما کر دیکھ لیگا کہ فی الواقع (انّ الانسان لفی خُسر) تنہا عقلِ انسانی ناکامیوں کی طرف ہی لے جانے والی ہے تو اس وقت وہ اِلّا کی طرف آئیگا۔ ابھی انسانیت لَا اِلٰہ کے تجارب میں مصروفِ عمل ہے۔ لیکن اس کا ہر قدم اِلّا کی طرف اٹھ رہا ہے۔ روس اس لا کے تجربہ میں سب سے پیش پیش تھا۔ لاسلاطین، لاکلیسا، لا الٰہ۔ ملوکیت کا انکار، مذہب کا انکار، اور ان کے ساتھ خدا کا بھی انکار۔

فکرِ او در تُندبادِ لا بماند   مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں   خویش را زیں تُندباد آرد بروں (اقبالؒ)

وہ مردِ حق بیں وحق گو۔ وہ حقائقِ کائنات کو نورِ قرآنی سے دیکھنے والا قلندر آج سے پانچ سال پیشتر یہ کہہ کر چلا گیا اور آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہی روس کس طرح اس نظامِ لا کو اپنے ہاتھوں سے آپ تباہ کر رہا ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ روس کا یہ نظام بھی پائیدار ثابت نہ ہوا۔ لہٰذا اس تجربہ سے دنیا کا ایک اور قدم اِلّا کی طرف بڑھ آیا۔ اس لئے کہ

در مقامِ لا نیاساید حیات   سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ اُمتاں   نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں (اقبالؒ)

دنیا اِلّا کی طرف جانے کے لئے خود مضطرب ہو رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصہ میں ہے کہ وہ دنیا کو اس جنت کی طرف لے جائے۔ پہلے خود اِلّا کا پیکر بنے اور اس کے بعد ساری دنیا کو اس قالب میں ڈھال لے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں و کم ماندہ دریں کشمکش اند (اقبالؒ)

— ۲ —

گذشتہ ماہ کے اہم ترین واقعات میں وہ بیان ہے جو جناب جناح نے وار کونسل میں شرکت کرنے والے مسلم لیگی حضرات کے بارے میں دیا ہے۔ قارئین طلوعِ اسلام کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ہم شروع سے ہی اس خیال کے مؤید رہے ہیں کہ جن لوگوں کو کسی جماعت کے ساتھ قلبی وابستگی نہیں اور وہ اپنے اعمال وعواطف کو

ملی مصالح پر قربان کر کے جماعتی نظم وضبط قائم نہیں رکھ سکتے اُن کا وجود جماعت کے لیے بڑے دور رس خطرات کا موجب ہوتا ہے۔ جناب جناح نے اس سے پیشتر ایسے حضرات کے متعلق کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کیا تھا اور ہر چند ہمیں ان (مسٹر جناح) کی اس روش سے اختلاف تھا لیکن چونکہ ہمیں ان کی نیت بخیر ہونے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ وہ اپنے خیال میں اپنے سکوت کو ملت کیلئے نفع مند تصور کرتے ہیں، اس لئے ہم نے اپنے آپکو اظہار حقیقت تک ہی محدود رکھا تھا۔ اب انھوں نے علانیہ وہ کچھ کہدیا جو ہم چاہتے تھے کہ وہ بہت عرصہ پہلے کہدیں قوم میں تشتت وافتراق کے خیال سے ہمارے دل پر کیا گذرتی ہے اس کا اندازہ کچھ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ جو ایک ایک فرد کے لیے جماعت میں شمولیت کی دعائیں مانگیں وہ بھلا کس طرح دیکھ سکیں کہ کچھ ذمہ دار افراد جماعت سے الگ ہو جائیں۔

گے تو انم دید زاہد وجام صہبا بشکند ۔۔۔ می پرد رنگم حیا سے گر بدریا بشکند

اس لیے ہم اب بھی اپنے ان فریب خوردہ بھائیوں سے درخواست کرینگے کہ وہ سوچیں کہ صدر جماعت کی اطاعت اور جماعت کا نظم وضبط کس قدر ضروری ہے اور ان کا تھوڑا سا ایثار قوم کے لیے کتنے بڑے نفع کا موجب ہے۔ خدا کرے کہ یہ آنے والا خطرہ اب بھی نصیب اعدا ہو جائے۔

(صلح)

گذشتہ اشاعت میں ہم نے خاکساروں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس باب میں مختلف مقامات سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ ہم اکبر تبہ اس حقیقت کو پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ ہم نے خاکساروں کو جو مشورہ دیا ہے وہ کوئی نیا مشورہ نہیں بلکہ ہم تو لاہور کے المناک حادثہ کے وقت سے آج تک یہی مشورہ دیتے چلے آرہے ہیں کہ خاکسار تشدد نہ برتیں۔ قانون شکنی نہ کریں اور حکومت سے مت الجھیں۔ امن قائم رکھیں۔ اور اس طرح ان غلط فہمیوں کو دور کردیں جو ان کے متعلق پیدا ہو چکی ہیں۔ خدمت خلق اور سرفرازی اسلام کا جذبہ بڑا مستحسن ہے اور اس کی پرورش قانون شکنی کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی راہ صواب کی راہ ہے۔

بین الاقوامی حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ اُن کے پیشِ نظر اب ہر جگہ خطرہ کا امکان ہے۔ ایسے نازک وقت میں ہم دوسروں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتے البتہ اپنے مسلمان بھائیوں کو ایک مرتبہ پھر یاد دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ یہ لوٹ مار قتل وغارت گری نہیں سکھاتا۔ اس لئے آپ کو اگر کہیں اشتعال بھی دلایا جائے تو اپنے آپ کو قابو میں رکھئے۔ البتہ اپنی حفاظت کے لئے پُرامن تنظیم کیجئے۔ اور یہ تنظیم مسلم لیگ کے مرکز کے ماتحت عمل میں لائیے۔ اس کی آج بڑی سخت ضرورت ہے۔

---

(۴)

گذشتہ ماہ ایک ایسا واقعہ گذرا ہے جو بڑا جانکاہ اور صبر آزما تھا۔ یہ واقعہ یوں تو طلوعِ اسلام کے گرمفرما جناب پرویز صاحب کی ذات سے متعلق ہے لیکن خود راقمِ سطور کے دل پر اس کا ایسا المناک اثر ہوا ہے کہ وہ اظہارِ غم کے لئے مجبور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنابِ پرویز کو جہاں اپنی متنوع عنایات سے نوازا ہے وہاں انھیں اولاد کی دولت سے محروم رکھا ہے۔ یہ مشیت کے انتظامات ہیں جن میں کسی کی سمجھ کو کوئی دخل نہیں۔ جناب پرویز کی یہ آرزو کئی مرتبہ دعاؤں کی صورت میں لب تک آگئی کہ اگر کوئی بچہ ہو تو میں اپنے خیال کے مطابق اس کی تربیت وتعلیم کا انتظام کروں اور پھر اسے قرآن کریم کا خادم بناؤں۔ گذشتہ فروری میں ان کی عزیز ہمشیرہ نے اپنا بچہ ان کی آغوش میں دے دیا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کی کیفیت بدل گئی۔ جناب پرویز کو اپنی آرزوؤں کا مرکز اور ان کے متعلقین (بالخصوص ضعیف والدین) کو زندگی بہلانے کا حسین ذریعہ مل گیا۔ ملنے جلنے والے بھی اس مسرت کے ماحول میں برابر کے شریک تھے اور زیادہ خوشی یہ تھی کہ بچہ عام سطح سے کہیں اونچا تھا۔ ذکاوت اور ذہانت کا آئینہ۔ شگفتگی وشادابی کا پیکر۔ مسرت وشادمانی کا ابلتا ہوا چشمہ۔ نور اور نکہت کی چھوٹی سی کائنات۔ چمکتا ہوا چہرہ۔ دمکتی ہوتی روح۔ یاسمینِ جنت کا گلِ نو بہار۔

اُمیدوں پر بہار آرہی تھی۔ تمنائیں جوان ہو رہی تھیں۔ مستقبل حال کے آئینہ میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ اور تقدیر مسکرا رہی تھی۔

شروع ماہ میں بچہ بیمار ہوا۔ امکان بھر تدابیر کر دیکھیں۔ معالجہ ونگرانی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ یہ پریشانی

جناب پرویز کی تنہا اپنی پریشانی نہ تھی۔ احباب برابر کے شریک تھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی وسعت کی حدود آزمائیں لیکن جب مشیت کو ہی منظور نہ ہو تو انسانی چارہ جوئی کیا کر سکے۔ ۱۹۵۴ء کی ورسیانی شب یہ آرزوں کا کھلونا گرا اور چور چور ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دنیا میں بچے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ موت کے صدمہ میں محبت اور افادیت دونوں شامل ہوتے ہیں لیکن جن حالات میں یہ بچہ آیا اور چلا گیا اپنے اندر ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور صدمہ اسی کے مطابق ہے۔ جناب پرویز ہمیں ہمت اور استقامت کا سبق دینے والے ہیں، اس لئے ہم ان کی خدمت میں کیا عرض کریں کہ وہ ہمت سے کام لیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس حوصلہ سے کام لیا ہے وہ خود کم از کم راقم الحروف کیلئے بڑا سبق آموز ہے۔ جناب پرویز کو طلوع اسلام سے جو قلبی تعلق ہے وہ ظاہر ہے لیکن بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان پر اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں۔ وہ اس کے لئے مضمون لکھتے ہیں تو ان کی عنایت ہے۔ لیکن ان پر تقاضا تو کسی قسم کا نہیں کیا جا سکتا، جو صدمہ ان پر گذرا ہے میرا خیال ہے کہ اگر ان کا کوئی اپنا پرچہ بھی ہوتا تو شاید اس کی اشاعت میں بھی ناغہ کر دیتے۔ لیکن طلوع اسلام کے ساتھ جو ان کا تعلق محض للّٰہیت کی بنا پر ہے اس کے پیش نظر پریشانی اور افکار کے اس ہجوم میں انھوں نے چالیس صفحہ کا مضمون تحریر فرما دیا جو زینت رسالہ ہے۔ جہاں ایک طرف یہ واقعہ ان کے جذبۂ خدمت قرآنی کا آئینہ دار ہے دوسری طرف ان کی استقامت اور حوصلہ مندی کی بھی زندہ دلیل ہے۔

جناب پرویز یقین فرمادیں کہ اس سے پیشتر ہی اُن کی عنایات کا کچھ کم احسان نہ تھا۔ لیکن ان کا یہ کرم اس قدر گراں بہا ہے کہ میری گردن احسان مندی کبھی اُٹھ نہیں سکتی۔ ہمدردی اور احسان مندی کے یہی جذبات ہیں جو ان سطور کے لکھنے کے محرک ہوئے ہیں۔ میں قارئین طلوع اسلام سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اپنے ان ذاتی جذبات کے اظہار کیلئے طلوع اسلام کا اتنا حصہ ان سے لے لیا۔ لیکن دل اس کے سوا مانتا نہیں تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب پرویز کی ان مقدس آرزوں کی تکمیل کیلئے انھیں نعم البدل عطا فرمائے۔ باقی رہی بچے کی یاد، سو اس کیلئے میں جناب پرویز کے اپنے تجویز کردہ لوح قبر سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ یعنی

اسلم اقبال
ایک حسین خواب جس کی تعبیر حیرت تھی !

(۵)

مذکورہ صدر پریشانی کی وجہ سے معارف القرآن کی تکمیل میں کچھ تعویق ہو گئی۔ بہرحال بتوفیق ایزدی کتاب پوری چھپ چکی ہے اور اب جزو بندی اور جلد سازی کا کام باقی ہے۔ کتاب ۲۲×۲۹ (طلوعِ اسلام سے بڑے) سائز کے ۷۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ۲۸ پونڈ کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ فہرست کتاب اشاعت حاضرہ کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کی جا رہی ہے۔ ہرچند فہرست مطالب کی طرف صرف اشارہ کر سکتی ہے تفصیل نہیں بتا سکتی اور اس لئے محض فہرست سے مضامین کا صحیح صحیح تصور قائم نہیں کیا جا سکتا لیکن کتاب کی ایک عمومی سی جھلک اس کے اندر نظر آ سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس عمومی جھلک سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ کتاب کن اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ پورا اندازہ تو کتاب دیکھنے پر ہی لگ سکیگا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب ہمارے دینی مدارس اور کالجوں میں درساً درساً پڑھائی جائے تو ہمارے نوجوانوں کے فکر و نظر کی بنیادیں درست ہو سکتی ہیں۔ بہرحال اب کتاب آپکے سامنے آجائیگی اور اس کے متعلق صحیح اندازہ آپ خود لگا لینگے۔

سب سے پہلے کتاب ان احباب کی خدمت میں وی پی بھیجی جائے گی جنھوں نے اپنے نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا رکھے ہیں۔ اس کے بعد خریداروں تک پہنچ سکیگی۔ جن احباب نے اپنے نام درج رجسٹر کرائے تھے اگر انھوں نے اپنا پتہ تبدیل کر لیا ہو تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر ہمیں مطلع فرما دیں تاکہ وی پی کہیں واپس نہ آجائے۔ براہ عنایت اپنے ہاں کے ڈاکخانہ والوں کو بھی تاکید کر دیجئے کہ وی پی جلدی میں واپس نہ فرما دیں۔ لاہور میں رہنے والے احباب کو الگ اطلاع دی جائیگی کہ انھیں کہاں سے کتاب مل سکتی ہے۔ کتاب کی کوئی ایجنسی نہیں ہے۔ کتاب مجلد اور بلا جلد شائع کی جا رہی ہے۔ بلا جلد کی قیمت پانچ روپے فی نسخہ۔ مجلد کی قیمت چھ روپیہ۔ جلد پختہ عمدہ اور خوبصورت ہے۔ فرمائش بھیجتے وقت تصریح کر دیجئے کہ بلا جلد مطلوب ہے یا مجلد۔ محصول ڈاک اس سے الگ ہے۔ کتاب وزنی ہے۔ اس لئے اگر ایک مقام کے احباب مل کر اکٹھی منگا لیں تو بذریعہ ریل سستی رہیگی۔

معذرت

(۱) سابقہ اشاعت میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں جس کے لئے ہم قارئینِ طلوعِ اسلام کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ کے لئے احتیاط کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

(۲) تبصرہ کے لئے بہت سی کتابیں جمع ہو گئی ہیں لیکن عدم گنجائش مانع ہے کہ اس اشاعت میں تنقید و تبصرہ شائع کیا جا سکے۔ ہم کتابیں بھیجنے والے حضرات سے اس تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

(۳) چونکہ اس اشاعت میں معارف القرآن کی فہرست شائع کی جانی تھی اس لئے پرچہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

(پرویز)

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک خاص رسم سی پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں۔ جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور یوں اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں تک میں نے ان اجتماعات کی روئداد کو پڑھا مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ ان میں زکم از کم اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری حسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم عام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیغام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں فطرت کے مطابق ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعت نظر۔ کشادگیٔ ظرف۔ رواداری۔ حسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی اس خصوصیت یعنی اس کی افضلیت و اکملیت۔ برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا۔ کیونکہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہلِ مذاہب کی دل شکنی ہوگی۔ اور وہ اسلام کے نمائندہ کو متعصب اور تنگ نظر خیال کریں گے لہٰذا رواداری اور کشادہ دلی کے اس غلط مفہوم میں اسلام کے نمائندوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے۔ جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس خاص نقطۂ خیال سے جہانتک اسلام کا تعلق ہے اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منتج نہیں ہوتیں بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو۔ لیکن ان کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پس پشت ڈال کر۔ اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لاکر کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں

اوائل جون میں شولاپور کے مقام پر اسی قسم کی ایک "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی۔ جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس چیز کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اور کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی ہے۔ اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع ومنہاج (یعنی فروعات) میں ہے۔ اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ شروع سے اخیر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اوّل) کے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے۔ جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعوے کی تائید ہوتی تھی (آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندو بھائیوں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے اپنے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے)

مجھے تو نہ ان اسباب و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے کچھ زیادہ واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی بجستہ بجستہ کچھ لکھا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر

تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہکر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہوسکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا موید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ "تمام مذاہب یکساں ہیں۔ عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات وسعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہوسکتی" وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بیں نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہوجاتی ہیں۔ اور جب اس سطحی کشش وجاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسر قرآن کی تائید بھی حاصل ہوجائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کون سی شئے مانع ہوسکتی ہے؟

روا داری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس غریب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شاہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات ومقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے، تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال واستیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرضِ وجود میں آئیں۔

برھموسماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی۔ لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی۔ اس لئے وہ ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ مجھے تحریک کے اس حصہ سے بھی تعلق نہیں تعلق ہے تو اس چیز سے کہ اس نظریہ کی اشاعت کا موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد اس سے پیشتر مسلمانوں میں ایک عالم اور مفسر کی حیثیت سے ایک امتیاز حاصل کرچکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا۔ سر پہ اٹھایا۔ اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے

اس کی تعریف و توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک ایسی خصوصیت موجود ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہے۔ لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں وفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ بر بنائے خود بینی نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس ازدحامِ مدح و ستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہل نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی۔ چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۲ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کو اربابِ ذوق کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد متفرق گوشوں سے اس نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہونے کو آئے چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے اس لئے ان کی یاد محو ہوتی گئی (متفرق مضامین کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے) اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ اور تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلہ طلوعِ اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا۔ لیکن ایسی یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ انہیں بہ تسلسل جاری نہ رکھا جائے۔ بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب والے بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلام سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جد و جہد جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے، بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین حیات) کے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمحِ نگاہ (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہو گا

اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریۂ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں راستوں میں اپنے بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل سے ہی کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ ہر قدم پر اُسے ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میری نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

اس شدت اور تکرار کی بنا پر جناب آزاد کے مؤیدین کے حلقہ سے میرے متعلق بعض اوقات یہاں تک کہا جاتا ہے کہ میری مخالفت جناب آزاد کی معاندت اور اُن کی تنقیص پر مبنی ہے۔ میں اس اعتراض کے جواب میں اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ چیز نیت سے متعلق ہے۔ جس کا علم اسی ذات کو ہو سکتا ہے جو دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اسلئے اس کا فیصلہ تو اُسی کے ہاں جاکر ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس خطرہ کو ایسا ہی محسوس کریگا جیسا میں کر رہا ہوں تو وہ اس کے استیصال کیلئے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیگا۔ میں اپنا دل چیر کر آپ کو کس طرح سے دکھاؤں کہ میں اس خطرہ کو کتنا شدید اور اس کے اثرات کو کتنا دور رس سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں تو اسے اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق سازگار رہے اس کے ازالہ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں۔ اس کے متعلق تفصیلی طور پر تو میں اپنی کتاب (معارف القرآن) کی کسی آئندہ جلد میں مناسب مقام پر لکھونگا۔ اسوقت گنجائش کی نسبت سے ہی کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آجکل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش پر اُتر آئے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب کو سب سے اعلیٰ و ارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح سے وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحثات و مناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی

کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے، اور یہاں مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جارہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور میں اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہل مذاہب کی وسعتِ نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں، اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ مثلاً زید کا ایک بچہ ہے۔ بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچے کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں یہ تو عمر کی خودستائی ہے کہ اپنے بچے جیسا کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!

فرمائیے کہ یہ اصول زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا حامل؟ آج ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کو دقت پیش آرہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم و عقل کی روشنی کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ انکے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور فطرتِ انسانی کی گوناگون مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے اِدھر اُدھر سے اصول و قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جارہی ہے کہ انھیں اپنے عقائد پر غیر متزلزل یقین نہیں رہا۔ اور مذہب سے وابستگی نہ صرف برگشتگی بلکہ بعض صورتوں میں نفرت اور بغاوت سے تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ بلکہ ان مذاہب کے اربابِ حل و عقد نے محسوس کر لیا ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے اس کے مقابلہ میں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا چلا جارہا ہے۔ انھیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ان کے مذہب کے پیروؤں کا سمجھدار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہوتا چلا جائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اعلیٰ و افضل ہے، کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔

اس لیے انھوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچہ کے متعلق اختیار کی تھی۔ انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اُتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جاسکے۔ اور اس طرح مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں۔ اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہو جایئے کہ اس سے بہتر مذہب دُنیا میں موجود ہیں۔ مذاہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظامِ زندگی۔ سو وہ مذہب کی الگ شے ہے۔ اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں رازِ حیات ہے۔ ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے۔ یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو وحدتِ ادیان کے نقاب میں چھپا لیا اور قوم کی اجتماعیت کے لیے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا!

یہ ہیں وہ مقتضیات وعواطف جن کے ماتحت "یکسانیتِ مذاہب" کی یہ تحریک وجود کوشش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس کی کیفیتِ قلبی کا بھی تو خیال کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انھیں اس امر کے اعتراف پہ مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی اُن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دُنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا اور یوں اس کی افضلیت واکملیت کا اقرار لیا جا سکتا تھا یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝

"اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ وہ دین تمام ادیانِ عالم پر غالب آجائے خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے"

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پہ ایمان رکھتا ہو کہئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ "تمام مذاہب یکساں ہیں" تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کروگے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں تو اسی قسم کا دعویٰ دوسرے اہلِ مذاہب بھی کرنے لگجائینگے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سو اول تو مقابلہ کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے مایوس ہو کر تنگ آچکی ہے اور انھیں خود تلاش ہے کہ ایسا نظریۂ حیات سامنے آجائے جس کے ماتحت انسان فطرت کے مطابق زندگی بسر کرسکے۔ جنھوں نے **قومیت** کو نقطۂ ماسکہ بنایا تھا وہ

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق نباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے۔ تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمر کے لئے تو یہ چیلنج نویدِ مسرت ہو کہ اس کے اور زید کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو پوچھ لے۔ ہم بتائینگے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے بلند و بالا ہے۔ لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اسوقت میں صرف انھیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھینگے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریقِ استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ تخاطب ان سے ہی جو قرآن کو حجت مانتے ہیں

سو اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل - دین و دنیا کی سرفرازی و سربلندی - ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہجِ زندگی (مذہب) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآن کریم اور جس کے عملی پیکر محمدؐ رسول اللہ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر محمول کیوں نہ کرے آپکو اس "تنگ نظری" پر دوسروں کے پیمانوں کے مطابق نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں قربان کر دینی ہونگی - اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے - اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور تنگ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے کوئی اور آسمان تلاش کر لیجئے - جہاں چھوٹے کو چھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے - جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے - جہاں سچے سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے چھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے - جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے - اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا ولو کرہ المشرکون - جب یہ حقیقت ثابت ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عملی شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۔ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ 2/159

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں، باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے - یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آئی ہیں"

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر قریب پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس کے اخیر میں انھوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں :-

" لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اُصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا دینُ خدا کی عام بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا۔ اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف کی اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اُس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اُس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے

تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہوگیا۔ اور انھوں نے مجھے قبول کرلیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ الدّین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۶۲-۶۳)

دوسرے مقام پر شرع و منہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں :-

"لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ لیکن روح و حقیقت اُن سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے" (۱۶۷)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دُہرایا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق و سباق کو ملاکر ملاحظہ کریں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے نجات و سعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور نیک عملی کی ہی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے۔ اور رسالت نبی اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعت محمدی یا شریعت قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام نیک عملی ہے) یعنی ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت یعنی اسلامی شریعت کی اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ نبی اکرمؐ سے پیشتر کسی نہ کسی رسول۔ اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کردیا جائے تو وہ اس اصول میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن پر بھی ایمان لائیں۔ یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہوجائیں۔

اگر قرآن کریم اہلِ کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے سوا نجات وسعادت کی کوئی راہ اور نہیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب اہلِ کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہلِ کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام و ملل میں حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت۔ اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے سامنے جھکا جائے۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں، مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے اختلاف ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف والحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی انسانیت خود اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت میں کچھ تو گذشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (سچائیوں) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا۔ ترمیم وتنسیخ بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن یہ ترمیم وتنسیخ ہمیشہ ارتقاء وعروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل وہبوط کی طرف نہیں لے جاتی تھی۔ ذیل کی آیتِ مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۔ ۲/۱۰۶

ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش

ہو جانے دیتے ہیں تو اُس کی جگہ اس سے بہتر یا اُس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔"

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اُس جیسا حکم۔ چنانچہ قرآن میں کُتبِ سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (وہ کلمات کو اُن کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انھیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انھوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (افسوس ہے اُن پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے) اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف۔ الحاق۔ فراموشی۔ دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں۔ اور پھر اس حقیقت بارہ پہ خود ایک دُنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بدلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو اُن کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لیے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ہاں! یہ سلسلۂ رُشد و ہدایت یونہی جاری رہا۔ تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رُشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آگیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے دُنیا میں بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ہی ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، اُن کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات بدل دیئے جائیں جو قیامت تک کے لیے انسانی ضروریات کیلئے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا اکٹھا کر کے اُسے محفوظ طریقہ پہ دنیا کو دیا گیا اور اسے قیامت تک کیلئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اس مجموعہ حقائق۔ ضابطۂ خداوندی کی اس (Latest) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآن کریم ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی اپنی آخری صورت تک پہنچا دیا گیا۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آگئیں۔ اب

نجات وسعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے ساقط العمل ہے۔ اب دین ہے تو یہی۔ اسلام ہے تو اسی کا نام۔ ایمان ہے تو اس پہ۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام۔ نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمیٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا۔ اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطہ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیائے کرام تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتے تھے۔ جو پیغامات انھوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات انبیائے کرام میں کوئی فرق۔ نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرمایا کہ اب اتباع واطاعت صرف اس مجموعۂ قوانین کی ہوگی جس کا نام قرآن کریم ہے اور شریعت صرف اس رسولِ کَافَّةً لِلنَّاس کی چلیگی جس کے بعد کوئی اور رسول نہیں۔ یہ ہے الدّین اور یہ ہے الاسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے۔ اور اسی سے نجات وسعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن کہ اصل دین ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہے (ترجمان القرآن ص ۱۳۷) "موجود تھیں" اور "موجود ہے" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اور یہی فرق ہے جس پہ اس جدید نظریہ کے حق وباطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ سارا قرآن ایمان ہی کی تفسیر ہے جس کے اس نے پانچ اجزاء بتائے ہیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۝ ۲/۱۷۷

"بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ، آخرت کے دن، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے"

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ ۴/۱۳۵

اور جو اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب و رسل اور یوم آخر سے انکار کرے

تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب بیان ہے کہ وہ بعض مقامات پر تو ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور دیگر مقامات پر اس تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفس موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۴۱/۲۹

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے

تو ان پر فرشتے نازل ہونگے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۲/۶۲

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر

ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۳/۱۷۹) "پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ" کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا "پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا"

غرضکہ مختلف مقامات پہ مختلف اجزا سے ایمان کا ذکر آتا ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پہ ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کفایت کر دیتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شقِ اول ہے۔

اب شقِ دوم کی طرف آئیے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ۔ رسل۔ کتب پہ ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پہ ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کی اتباع کی جائے (اطیعوا اللہ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا تو ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا۔ تصور میں اختلاف ہوگا۔ تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملیگا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پہ اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ سو ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذاتِ باریتعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت۔ یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم۔۔ اسی طرح رسولوں پہ ایمان سے مفہوم بھی ان کی اطاعت ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد ہی اتباع ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴/۶۴)

"اور کسی رسول کو ہم نے نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کی جائے"

رسولوں کے ساتھ کتابوں پہ ایمان... سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے

قرآن کریم کے متعلق فرمایا:-

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اُتارا گیا ہے، اُس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے۔ خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ رسولوں کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت ہے کہ وہ اُسی کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ کتابوں کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت ہے کہ وہ اُسی کے احکام کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے نبی اکرمؐ سے پہلے رسولوں اور قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی۔ وہ کتابیں ضائع ہو گئیں۔ محرف ہو گئیں یا ساقط العمل قرار پا گئیں۔ لہٰذا اُن کی اطاعت بھی ختم ہو گئی اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اُس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ ان سب کے بعد نبی آخر الزمان تشریف لائے۔ جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآن کریم کی اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور اُن کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے۔ اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آ چکے ہیں

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ۔

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اُتاری جو پہلی کتابوں (کی سچائیوں) کی تصدیق کرتی ہے اور اُن (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے کہ ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ضابطۂ قوانین کا ہر نیا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔

بنابریں قرآن کریم کے بعد مختلف اہل مذاہب (یا اہل کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہوکر زندگی بسر کرنا اصولاً غلط ہے۔ اب سچائیاں (اُن کے ہاں کی اور اُن کے علاوہ وہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کی اتباع ضروری ہوجاتی تھی۔ اس لئے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہہ دیں کہ جب رشد و ہدایتِ آسمانی کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجائے۔ جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آسکے گی۔ تو تم سب کو اسی آخری کڑی کی اتباع کرنی ہوگی۔ سورۂ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ بارِ الٰہا! تو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوا کہ بیشک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ اُن کے حصّہ میں ہی آسکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے یعنی اُن کی اتباع کریں گے۔

فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ
فِي التَّوْرٰةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ
الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي
أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۷: ۱۵۶-۱۵۷)

وہ رحمت میں اُن لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اس نبی اُمّی کا اتباع کریں گے جسے وہ توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دیگا۔ بُری باتوں سے منع کریگا۔ پاکیزہ چیزیں اُن کے لئے حلال کرے گا۔ ناپاک چیزیں حرام کریگا۔ اور وہ طوق و سلاسل جو اُن پر پڑے ہوئے ہونگے اُن کو اُن سے الگ کر دیگا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائینگے

اور اُس کی عزت کریں گے اور اُس کی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔"

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے۔ نبی اکرمؐ پر ایمان اور قرآن کریم کی اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۱–۸۵)

"جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ "ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تصدیق ہو اُس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اُس پر ایمان لانا۔ اور اُس کی تائید کرنا۔" فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا کہ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا اور دیکھو! تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد و قرار کے بعد اس سے روگردانی کریگا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان وزمین میں جوکوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول! تم کہدو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء کو دیا گیا اُن کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تو دیکھو - جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کریگا۔ تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کی جگہ اُن لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہونگے۔ "

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ اُن کی وساطت سے ان کی اُمتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتب سماوی کے جو بچے کھچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں اُن میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاءؑ رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخرالزمان) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ یہی اس نظامِ خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضورؐ پر ایمان (یعنی اطاعت) کے بغیر نجات وسعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسرے میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے۔ (۴/۱۵۰)

شقِ دوم سے ظاہر ہے کہ

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انھیں مان لینا نہیں بلکہ اُن کی اطاعت کرنا ہے

(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں اُن کی اطاعت فرض تھی۔

(۳) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں کہ حضورؐ کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئیگا اس لئے حضورؐ کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے۔ اور تمام نوعِ انسانی کیلئے ہے۔

(۴) اب جو کوئی خدا۔ اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح نبی اکرمؐ نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (۲/۱۳۷)

"پس اگر یہ لوگ اسی پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہ ہدایت پر ہونگے اور اگر یہ اس سے پھر جائینگے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔"

کہا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمدؐ رسول اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں۔ یعنی وہ حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجۂ رسالت وعبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے (ص۱۱۹) یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء کرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے

لیکن

(۲) نجات وسعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی اُن کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف محمدؐ رسول اللہ کی کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی حضرت محمدؐ رسول اللہ کو منجانب اللہ سمجھ لیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کی کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمدؐ رسول اللہ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شقِ دوم میں قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرمؐ (یا کتبِ سابقہ اور قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی

فرق ہوگا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہونگے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی۔ اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا۔ لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کی ہی لازم ہوتی۔ لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے لیکن نبی آخرالزمان کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی۔ اس لئے کہ اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار کر لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب ہی کی جائے۔ اگر نبی اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں ہے۔ کفر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ
وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ٥

اے نوعِ انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آگیا ہے۔ سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑیگا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔ وہ خدا کی طرف کے سچے رسول تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں۔ تو سوچئے تو سہی کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے! یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف کے

حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا۔ اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت، وسعادت، حضورؐ کے اتباع سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اتباع واطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا سچا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا۔ اگر مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا؟

پچھلے دنوں نیاز فتحپوری صاحب (مدیر نگار) نے بھی ایک اسی قسم کی بات کہی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ میں رسول اللہ صلعم کو سچا تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن قرآن کو منزل من اللہ نہیں مانتا۔ یعنی رسول اللہ صلعم تو سچے ہیں لیکن اُن کا یہ ارشاد کہ قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے (معاذ اللہ) سچا نہیں ہے۔ اسی قسم کے دعاوی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلعم خدا کے سچے رسول ہیں اور قرآن کریم خدا کا پیغام بھی ہے۔ لیکن اس کی اطاعت ضروری نہیں۔ یقین مانیے جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور "وسعت نظر" کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں۔ اور جو مسلمان انھیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا امکان بھی ہے کہ رسول اللہ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی بھی کی جا سکتی ہے تو ان کے اس فریب پر مُہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں:۔

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر ورسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے۔ بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا اوف ریلجنس اینڈ ایتھکس)

"رواداری" اور "وسعت نظر" کے تمام گوشے اس تسلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں

کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت اور صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں۔ مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتناء نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو وہ بھی اس عقیدہ کا ہم نوا ہو جائے تو اُسے کیا کہئے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر رہا ہے کہ

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاًۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (۷/۱۵۸)

(اے رسول! ان سے کہدو کہ) اے نوعِ انسانی - میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسولِ اکرم کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو خدا کی سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہے تا وقتیکہ وہ ان کی اتباع نہ کرے۔ اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

اب شقِ سوم کی طرف آئیے۔ یعنی کیا اتباع میں احکامِ شریعت کی اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر "خدا پرستی اور نیک عملی" ہی نجات و سعادت کے لئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:-

" (ھ) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا۔ اور یہ اختلاف

ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلافات پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔"

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ ...... (ترجمان القرآن جلد اول ص۱۶۳)

ان اقتباسات کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت ۶۲ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابلِ ملاحظہ ہے :-

"(ھ) دین حق کی اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خداپرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔" (ص۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبہ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خداپرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے۔ اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور و طریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق ہے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجرِ مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی اکرمؐ سے پہلے جتنے حضراتِ انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا پڑا ہوتا۔ اس لئے ان کی وساطت سے جو تشریعی احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم۔ ملک۔ قبیلہ۔ گروہ یا کسی خاص وقت

کے لئے نہیں بلکہ آپ کا پیغام عالمگیر اور آپ کی مخاطب تمام نوعِ انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر زمانہ میں، قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے حضور کی رسالت یکساں ہے۔ اس لئے جو تشریعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے خاص حالات کو سامنے رکھکر وضع نہیں کئے گئے بلکہ وہ فطرتِ انسانی کے پیش نظر نافذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے اُن کا اطلاق عالمگیر ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کریم کے تشریعی احکام نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی "عالمگیریت" کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اگر اس نے (مثلاً) ربوا (سود) یا لحم خنزیر کو حرام قرار دیا ہے تو اس لئے نہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر کے اہل عرب کی معاشی اور معاشرتی (یا طبعی) حالات کا ایسا ہی تقاضا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ یہ چیزیں فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں اس لئے خلاقِ فطرت نے اپنے دینِ فطرت میں فطرتِ انسانی کے مصالح کے پیشِ نظر انھیں حرام قرار دیا ہے۔ یہ آج بھی اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج سے چودہ سو سال پیشتر حرام تھیں۔ اور تبت کے پہاڑوں میں رہنے والوں کے لئے بھی اسی طرح مضر ہیں جس طرح صحرائے عرب کے بدوؤں کے لئے۔ دنیا میں جب اور جہاں بھی انسان ہوگا۔ یہ چیزیں اس کے لئے حرام ہوں گی۔ اس لئے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ

"ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔"

اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھکر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی طریق سے ادا کرنے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ظواہر و رسوم (عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی) حضورؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالاتِ زندگی کے پیش نظر

اختیار کیے گئے تھے اور آج انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نجات اور سعادت میں انھیں کوئی دخل نہیں ۔ کوئی جاہل ہوتا تو اُسے ہم سمجھا تے بھی ۔ حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے اور نظام کا ہر جزو ۔ کُل پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ عبادات کی مخصوص شکلیں اور کھانے پینے کی چیزوں پر پابندیاں اس نظام اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے یا اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ "نجات و سعادت" ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے ۔ "نجات و سعادت" اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے ۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجیے یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا ۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں، تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ جن میں عبادات کی شکلوں اور کھانے پینے کی پابندیوں یا اس قسم کی کسی دوسری بات" کو کوئی دخل نہ ہو ۔ قرآن کریم کو کھولیے اور دیکھیے کہ اس میں ان "پابندیوں" کو کتنی اہمیت دی گئی ہے ۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۔ اہل کتاب خدا کو بھی مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے ۔ باایں ہمہ مسلمانوں کو جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح ان اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا ۔ اس حکم کے وقت اہل کتاب کے خلاف جو فرد جرم (چارج شیٹ) قائم کی گئی ہے اُسے ملاحظہ فرمایئے ۔ ارشاد ہوا ۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ‎﴿۹ / ۲۹﴾‏

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ اُن چیزوں کو حرام کہتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں اُن سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کریں ۔

اس آیہ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہو گئی :-

(۱) اہل کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم ان کے اس ایمان کو

ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ شقِ اوّل میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو نبی اکرمؐ نے بتایا ہے اور جس کی رو سے حضورؐ اور قرآن کریم پر ایمان (یعنی اطاعت) ضروری ہے۔

(۲) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام و حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عائد کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف "خدا پرستی اور نیک عملی" (بزعمِ خویش) کا نام نہیں بلکہ قرآن کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑہ میں اس امر کی وضاحت بیان فرما دی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اُن کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۹/۳۳ ؛ ۴۸/۲۸ ؛ ۶۱/۹

مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ لیکن چونکہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے اُنھوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مطلب مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

"اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر۔ نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ اور اُس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں ......" (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۸۳)

ذرا غور فرمائیے۔ ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافہ نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ "یہ لوگ اُن چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے"۔ یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انھیں حرام نہیں سمجھتے۔ لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر "جنھیں اللہ اور اُس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے" یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ اُن چیزوں کو حرام سمجھیں جو "ان کی کتاب میں" حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اندازہ فرمائیے قرآن کریم پر

یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کیسی بیباک ہے!

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رو سے اجزاے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا۔ مقصود اس سے پانچوں اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزاے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزوِ لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کے بعد اطاعت خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور اُن کی اطاعت لازمی۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیتِ مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود اور نصاریٰ اور صابئین۔ جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے اُن کا اجر اُن کے اللہ کے پاس ہے اور اُن کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ و صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا

مطالبہ ہے۔ رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت صرف اپنی دو اجزاء پر ایمان مقصود نہیں بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۔ (اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو تو پھر ہدایت پر سمجھے جائیں گے)

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا ہی مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمان کا بھی ذکر ہے تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں؟ اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر کچھ میں نہیں آتا کہ رسالت اور قرآن پر ایمان کا کن سے مطالبہ ہوگا!

پھر یہ کہ یہود و نصاریٰ اور مسلمان تو پہلے ہی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ خدا اور آخرت پر ایمان لے آؤ۔ کیا معنے رکھتا ہے؟

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پیشتر لوگوں نے مذہب کو نسلوں (قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ تورات۔ قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہب عیسوی بھی انہی کے لئے۔ کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ "میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی"۔ ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رو سے ہوتی ہے۔ اور ورنوں کی یہ کیفیت کہ نچلے ورن کا ہندو نہ اوپر کے ورن میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حریم قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودیوں کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد) میں داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ایک برہمن پیدائش کی رو سے برہمن ہے۔ یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ

(۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف

پیدائش ہی کی رو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں۔ (واضح رہے کہ عیسائیوں کے ہاں تبلیغ بھی بعد کی چیز ہے اور ہندوؤں نے تو اسے ابھی کل اختیار کیا ہے)

قرآن نے آکر ان غلط نظریات کی تردید کی اور پورے زور کے ساتھ اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی۔ نصرانی۔ صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے اور اعمالِ صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے (مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥) باقی رہے مسلمان۔ سو انھیں بھی اس زعمِ باطل میں نہ رہنا چاہئے کہ وہ مجرد اس امر کے کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہیں، نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انھیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمالِ صالحہ کے ذریعے جنت کا مستحق بنانا ہوگا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ

رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ ٤/١٣٦

اے مسلمانو! (ایمان والو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس کتاب پر

جو اس کے رسول پر نازل کی گئی۔ اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان محض زبان تک محدود تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا نہ اعمالِ حیات اس کے مصدق (انھیں منافقین کہا گیا ہے) زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی لیکن میدانِ جہاد ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ ادھر اُدھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اصطلاحی "مسلمان" تھے۔ ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابل میں وہ سچے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ
رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ ۹/۴۴-۴۵

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اُن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیۂ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔

(۱) وہ اہلِ ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے ظاہر ہے کہ وہ اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن یہاں صرف دو اجزائے ایمانیہ کا ذکر ہی کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے۔ مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے تھے۔ لیکن قرآن اُن کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا۔ اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔"

(۳) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ "اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدائشی مسلمان ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہئے اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ۴۹/۱۵

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں)

انھیں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے
جہاد کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود مسلمانوں سے بھی ایمان کا مطالبہ کیوں ہے؟ قرآن کے نزدیک تو ایمان کا معیار ہی کچھ اور ہے۔ فرمایا :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ۴/۶۵

قسم ہے تمہارے رب کی۔ یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان میں آپس میں جو جھگڑا ہو اس میں یہ لوگ تمہیں حکم مان لیں۔ پھر تمہارے فیصلہ کے خلاف دل میں ذرا بھی خلش محسوس نہ کریں اور پورے طور پہ تسلیم کرلیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں اب ذرا فریقِ مقابل کے نظریہ کا تجزیہ کیجئے۔ یعنی ایک مسلمان کے لئے "نجات وسعادت" حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پہ اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیبِ خاطر منظور کرتا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے۔ عبادات (نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ) کی کٹھن منازل کو آرام و راحت پہ ترجیح دے۔ اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پہ رکھے۔ اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے تب جاکر کہیں بتوفیقِ ایزدی "نجات وسعادت" کا متوقع ہو۔ اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی" کرلے۔ اور کبھی کبھار کچھ "دان" (خیرات) کردے۔ مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا۔ سانڈ کے لئے چارہ خرید دیا کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پہ آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بنوا دیا۔ اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ "دان" (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت۔ نہ اسلامی عبادات کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی

صعوبات اٹھانا ضروری۔ نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال درپیش (وہاں تو بلکہ جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ اہنسا میں داخل ہے) یہی نہیں - بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرلے اور جس نظام کے ماتحت جی چاہے زندگی بسر کرے۔ وہاں نظام۔ انسانی اور خدائی نظام۔ یا عدم نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کد و کاوش کا منتہیٰ ٹھہرا حصول نجات۔ اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جانگسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے۔ تو وہ کون سا "صحیح العقل" انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریق زندگی اختیار کرے گا جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور و طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو۔ تمہارے لئے نجات یقینی ہے۔ اگر "رواداری اور وسعت نظر" کی ایسی "صلح کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی۔ نہ کوئی برسرپیکار ہوتا۔ نہ حضور اور آپ کے متبعین کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا نہ مکہ چھوڑنا پڑتا۔ نہ مدنی زندگی ہی میں اس قدر غزوات اور سرایا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی۔ اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان سا مل جاتا اور پھر اس کے بعد آج تک یہ جو چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے۔ اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) "مومن" ہوتی اور کفر و اسلام، حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔

"خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ پر ذرا پھر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کر لے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کرے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رواج پذیر ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی

مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جن کے لیے وہ کبھی اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں "پرستش" کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش، پوجا یا (WORSHIP) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کے لئے عبودیت کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکرانیت مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ جب انسانیت اپنے عہدِ طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی بالکل انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش۔ پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں خدا کے ساتھ انتہائی تعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچے کودے۔ جشنِ شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوی، دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ بہر حال اسے خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحیِ آسمانی کی روشنی آگئی اس نے انسانی تصورات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے سہنے کی طرح ڈالی۔ اب یکسر انفرادیت سے قبائلی زندگی کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا۔ اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات تھے اس کے اندازہ سے احکامِ الٰہی ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع، فرمانبردار اور فرمانروا کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہ رہتی تھی۔ اس لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی۔ شکلیں بگڑ جاتیں۔ خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا۔ اور پھر وہی "پرستش" کا ابتدائی تصور غالب آجاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ

اجتماعیت کی تشکیل پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انھیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کی سکل ترین صورتوں کے لئے آئین و قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر آئین و ضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہونگے وہ انسانیت کی نشو و ارتقار کے راستہ میں حائل ہونگے۔ فطرتِ انسانی کے مطابق صرف وہ ضابطۂ حیات درست ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعتوں کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جد و جہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو۔ یعنی انسان اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ ہو۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق یعنی عبد و معبود۔ محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنے اوپر خدا کی حکومت کو مسلط کر لیا جاتے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انسانیت کے عہدِ طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں "خدا پرستی" تو ہر مذہب کیا ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ لیکن خدا کی عبودیت (محکومیت) صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ جس ضابطۂ خداوندی کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے وہ آج قرآن کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ معبودیتِ خداوندی (یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنے) کا ہے۔ "خدا پرستی" (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے) کا نہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت (عبدیت) کو جائز نہیں سمجھتا۔ باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ یعنی

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار۔	اللہ پر ایمان
(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے	کتابوں پر ایمان
(۳ و ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرام پر نازل ہوتے رہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں	ملائکہ اور رسولوں پر ایمان

(۵) اس طرزِ زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے - اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں } آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم - ان اجزاءِ ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا - مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے -

اب رہی "نیک عملی" سو روحِ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے نیک ہے - اور جو اس کے خلاف ہو بُرا ہے انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا - اسی طرح اس کا نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا - اُس زمانہ میں چونکہ زندگی انفرادی تھی اور نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا - مثلاً اگر وہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے - ضعیفوں کی مدد کرتا ہے - جانوروں پر شفقت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ - تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتا - اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہو سکتی ہیں - لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے - اُس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے اساس و مبانی کیا ہیں - وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی وضع کرتی ہے - دنیا پر اس تہذیب و نظام کے اثرات کیا ہیں - اگر اس کے اثرات انسانیت کش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی "نیکیاں" (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پا سکتیں - جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو ہیں ان کا کوئی عمل، عملِ صالح نہیں کہلا سکتا - کسی کی رگِ جان پر جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا سطحی بیں نگاہوں میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے - قرآن کریم نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے - جس کے اندر اس قسم کے بظاہر نیک اعمال - فی الحقیقت نیک ہوتے ہیں - اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے - ایک شخص بڑا مخیر ہے - اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے - غریبوں کی امداد کرتا ہے - عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں - لیکن حکومتِ وقت کو حکومت تسلیم نہیں کرتا - یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے تو حکومت کی نگاہوں میں یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی "ذاتی نیکیاں" اس کے

مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اُسے سخت ترین سزا دی جائیگی
خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کُفر
اب آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائگاں جاتے ہیں)، جنھیں وہ نیک اعمال سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ....
.... فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۲۴/۴۰-۳۹

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے اُن کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں۔ جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز اُسے نظر نہیں آتی۔ (البتہ) وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اُسے پورا پورا حساب دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا (اُن کے اعمال) ایک بحرِ ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور اُن کے اوپر (سیاہ) بادل تو بر تو ظلمات (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سُجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اُسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظامِ حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ .... الظّٰلِمِيْنَ ۹/۱۹

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانۂ کعبہ کی خدمت (کرنے والا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان

رکھتا ہے۔ اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرتا ہے (تمھاری سطح بین نگاہیں کچھ ہی کہیں)
اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔"
قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآنی معیار
کے مطابق "نیک عمل" کسے کہتے ہیں۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات وسعادت کے لئے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں۔ "خدا پرستی اور نیک عمل" جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے، نجات کے لئے کافی ہے، کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی صورت میں بھی کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا۔ وہ تو امن وسلامتی کا پیامبر ہے۔ اس دعوے کا اعلان وتبلیغ نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمھارا مرض اِدھر اُدھر کے بیقاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے تو فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اس کی طرف سے سرزد ہوتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں۔ جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو۔ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانہ سے مل سکیں گے تو ہر دواخانہ کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وَفِيهَا آيَاتٌ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

گذشتہ اوراق میں "نجات" کا ذکر بار بار آیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی جد و جہد کا منتہیٰ ہی یہی ہے۔ قرآن کی رو سے نجات کسے کہتے ہیں یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ جس کے متعلق انشاء اللہ العزیز کسی دوسرے وقت میں کچھ عرض کیا جا سکیگا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

اِسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

ازجناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے۔ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے اس کی عادات واخلاق کا خاکہ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدّن ومعاشرت کے خط وخال اس کی تعلیم وتہذیب اس کے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز واُسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے۔ اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کرلیا جائے تو طلبار کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔

قیمت چار آنے محصول ایک آنہ

ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

رومی نطشے اور اقبال

از

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ) (قسط ثانی)

حکمت شعار انسان ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ارتقا نے اس کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ نوع انسان کی زندگی اخلاق و مذہب کے بجائے حکمت پر مبنی ہوگی اس آیندہ ابھرنے والے آفتاب کی کرنیں ابھی روح انسانی کی چوٹیوں پر پڑتی ہیں۔ نیچے وادی میں کہر اور اندھیرا ہے۔

مذہب اور فن لطیف نے نوع انسان کے لئے ماں اور دایہ کا کام کیا ہے لیکن شباب کو پہنچکر نہ ماں کی ضرورت رہتی ہے اور نہ دایہ کی۔

سیاسیات میں نطشے کا خیال ہے کہ تمام اعلیٰ درجے کی تہذیب وہاں پیدا ہوئی ہے جہاں جماعت کے دو طبقے تھے۔ ایک جبری محنت کرنے والا، ایک آزاد اور اختیاری محنت کرنے والا۔ جنگ کے خلاف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس سے فاتح احمق ہوجاتا ہے اور مفتوح بداندیش اور حاسد۔ اس کے موافق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب انسانی کے لئے جنگ ایک قسم کی نیند ہے۔ اس نیند سے اٹھنے کے بعد نوع انسان زیادہ تازہ دم ہوجاتی ہے۔

اشتراکیئین کہتے ہیں کہ ملکیت اور سرمائے کی تقسیم ظلم اور عدم انصاف پر مبنی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام تہذیب کی بنیاد ظلم اور غلامی اور مکر و فریب ہے۔ یہ چیزیں تہذیب کے رگ وپے میں سرایت کرچکی ہیں۔ کسی فوری انقلاب سے ان کا علاج نہیں ہوسکتا۔ فقط احساس عدل کی تدریجی ترقی سے ان کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

یورپ میں اقوام کی تقسیم آگے چل کر ناپید ہوجائے گی۔ نطشے جمہوریت کا دشمن ہے اور اقبال نے بھی جابجا اپنی نظموں میں جمہوریت پر نکتہ چینی کی ہے۔ نطشے کو جمہوریت پر یہ اعتراض ہے کہ یہ اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے اخلاق اور قانون دونوں انسانوں میں مساوات کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں۔ عیسائیت کی قسم کے دوں ہمت اور سفلہ پرور مذاہب نے بھی یہ دھوکا پھیلایا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ یہ ایک صریح فریب ہے جس کی شہادت واقعات سے کسی طرح بھی نہیں مل سکتی۔ ارتقائے حیات میں قدم اعلیٰ افراد کی طرف سے اٹھتا ہے جو اپنے معاصرین سے جداگانہ

نقطۂ نظر رکھتے ہیں مساواتی دین و آئین ایسے افراد کو خطرناک تصور کرتا ہے اور ہر طریقے سے ان کو فنا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترقیٔ حیات کبھی جمہور کی رائے سے نہیں ہوئی العوام کالانعام ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

از آں کہ پیروی خلق گمرہی آرد — نمی روم براہے کہ کارواں رفت است

نطشے ایک ارتقائی مفکر ہے لیکن دوسرے ارتقائی مفکروں سے اس کا نقطۂ نظر کسی قدر الگ ہے۔ ڈارون اور اسپنسر اور ان کے پیروؤں نے تنازع للبقا یا پیکار حیات کو انواع کی پیکار قرار دیا اور اگر اس کشمکش میں کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد یہ ہے کہ ایک نوع بقائے حیات کے لئے دوسروں سے زیادہ قوی اور صالح ہو جائے نطشے جب فوق البشر کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطمع نظر نوع نہیں بلکہ فرد ہے۔ تاریخ اور فطرت کا یہ میلان ہے یا ہونا چاہئیے کہ اس میں اعلیٰ درجے کے افراد پیدا ہوں جو آئین مساوات کے زیر اثر نہ ہوں، حقیقت میں آزاد ہوں مقلد نہ ہوں، صداقت کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مقدم سمجھیں، سود و زیاں اور بیم و رجا سے پیدا شدہ امتیاز خیر و شر سے ماورا ہوں، جن کا قانون خود اپنے اندر ہو۔ جن کو ہر حیات بخش چیز صحیح اور ہر حیات کش طریقہ ناقابل قبول معلوم ہو۔ زندگی کا مدار اگر محض عوام کی رائے پر ہوتا تو انسان دوسرے جانوروں سے بھی پست تر ہو جاتا جہاں برائے نام جمہوریت کا نظام پایا جاتا ہے۔ وہاں بھی حقیقی فیصلے چند قوی افراد ہی کرتے ہیں اور باقی سب بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اقوام کے اہم اور نازک حالات میں کبھی جمہوریت سے کام نہیں چل سکتا نطشے کے ہم خیال ہو کر موجودہ دنیا کے تمام بڑے بڑے ماہرین اور مصلحین مساواتی جمہوریت کے مخالف ہیں۔ قدیم زمانے میں جمہوریہ افلاطون، بھی جمہوریت ہی کے خلاف ایک شدید حرب و ضرب تھی۔ افلاطون کے نزدیک وہ جمہوریت جس میں سقراط جیسے انسان کو مخرب اخلاق اور دشمن انسانیت سمجھ کر زہر پلایا جائے۔ کسی حیثیت سے مستحسن نہیں ہو سکتی اس قسم کی جمہوریت حقیقت میں ادنیٰ درجے کے انسانوں کی ایک سازش ہے جو افراد آزاد کے خلاف کی جاتی ہے۔ اس جمہوریت میں کور چشم اور تیرہ دل استبداد پسند افراد مملکت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے انسان اس میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ افلاطون نے اس جمہوریت کے خلاف اس وقت احتجاج کیا۔ جبکہ اس کی قوم اس طرز حکومت کی دل دادہ تھی اور اس کو بہترین طرز حکومت سمجھتی تھی۔ نطشے نے اس کے خلاف اس وقت جہاد کیا جب کہ تمام مغرب اس کا فریفتہ تھا۔ اقبال نے بھی ہندوستان میں اس کی پوست کندہ حقیقت کو اس زمانے میں پیش کیا جب کہ انگریزی ملوکیت اور انگریزی خیالات کے زیر اثر مشرقی اقوام اس سے مسحور ہو رہی تھیں کارل مارکس اور لینن نے کلیسائی مذہب کی جمہور کے لئے ایک افیون قرار دیا تھا لیکن نطشے کہتا ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت

بھی عوام اور اقوام غلام کی ایک سازش ہے اور ایک طریق حیات ہے جس میں اعلیٰ درجے کے آزاد افراد پیدا نہیں ہو سکتے۔ اقبال اس جمہوری نظام کو سرمایہ داروں کا دام تزویر سمجھتا ہے۔ جلال الدین رومیؒ نے عوام کو ہمرہان سست عناصر قرار دیا ہے اور ان سے دل گرفتگی کا اظہار کیا ہے۔ غالب بھی اسی رنگ کا متفکر شاعر ہے جو عوام کو گدھے سمجھتا ہے اور اپنے ظریفانہ انداز میں کہتا ہے کہ ہیں تو سب گدھے لیکن اس مجمع جہال میں بعض خر عیسیٰ ہیں اور بعض خر دجال۔ مرزا غالب کا طرز بیان اس بارے میں ایسا نادر ہے کہ اگر نطشے کو اس کا علم ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بہت داد دیتا۔ اقبال نے بھی اس خیال کے اظہار میں جابجا بہت لطیف پیرائے اختیار کئے ہیں کبھی تو وہ کہتا ہے کہ یہ دیو استبداد ہی ہے جو جمہوری قبا میں رقصاں ہے اور کبھی مساواتی جمہوریت کی بابت یہ فتویٰ دیتا ہے کہ :-

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

پیام مشرق میں نطشے کا اثر اس قدر نمایاں نہیں جتنا کہ اسرار خودی میں ہے۔ تاہم جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک اقبال نطشے کی تعلیم کے بعض پہلوؤں کو صحیح اور قابل تبلیغ سمجھتا ہے۔ مذہبی وجدان کا عام رُخ ذات الٰہی کی طرف رہتا ہے اور مشرق و مغرب کا اسلامی اور غیر اسلامی تصوف بھی خدا شناسی اور خدا رسی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے لیکن خدا سے پہلے آدمی کی تلاش کرنا جو اقبال کی شاعری کا امتیازی عنصر ہے، نطشے اور اقبالؒ میں ایک قدر مشترک ہے۔ اسلامی تصوف اس انداز تخیل سے ناآشنا نہیں تھا۔ عبدالکریم جیلی کی مشہور تصنیف 'الانسان الکامل' میں اسی قسم کا فلسفہ مابعد الطبیعیاتی اور متصوفانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے مولانا روم کی مثنوی اور دیوان میں بہت سے اشعار اسی موضوع کے ملتے ہیں اور قرآن کریم کا مسخر کائنات آدم بھی ایسے ہی افکار کا سر چشمہ ہے۔ مرور ایام سے مسلمانوں میں یہ انداز فکر قریباً ناپید ہو گیا تھا کہ یک بیک اقبال نے اس زور سے اس کا اعلان کیا کہ وہ اس کی زبان سے ایک نوزائیدہ اور جدید نظریہ حیات معلوم ہوتا ہے زمانۂ حال میں نطشے نے اس قدر علو آدم پر اپنی نگاہیں جمائیں کہ وہ خدا سے بالکل بیگانہ ہو گیا نطشے نہ خدا پرست ہے نہ دہر پرست، وہ آدم پرست ہے لیکن اس کا آدم وہ آدم نہیں جو اس کے سامنے موجود ہے اس کا آدم ابھی تک کتم عدم میں ہے۔ وہ اسے معرض وجود میں لانا ارتقائے حیات کا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتا ہے۔ نصب العین آدم کی تلاش نطشے اور اقبالؒ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دیو جانس کلبی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ دن میں چراغ لے کر منڈی میں پھر رہا تھا۔ اپنی قوم اسے ایک منکی حکیم سمجھتی تھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت دن دہاڑے چراغ لے کر کیا ڈھونڈھ رہے ہیں؟ کہنے لگا آدمی کو ڈھونڈھتا ہوں۔ جب اسے کہا گیا کہ آدمیوں کا ہجوم تمہیں نظر نہیں آتا؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب ادنیٰ درجے کی مخلوق ہے، آدمی ان

ان میں ایک بھی نہیں یہی شیخ دیو جانس ہیں جن کا فلسفہ اس قصے کے پیرائے میں مولانا روم نے ان اشعار میں لکھا ہے جو اقبال کو اس قدر پسند تھے کہ انھیں اپنی کتاب کے سرورق پر درج کیا ہے :۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر | کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو است
از ہمرہان سست عناصر دلم گرفت | شیر خدا و رستم دستانم آرزو است
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما | گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو است

اس امر میں اقبال کے خیالات ایک طرف اسلامی مفکرین خصوصاً جلال الدین رومی سے ملے ہوتے ہیں اور دوسری طرف نطشے سے مگر فرق یہ ہے کہ رومی اور اقبال کے ہاں خدا بھی موجود ہے اور نطشے کے نزدیک خود اسی کے الفاظ میں "خدا کا انتقال ہو چکا ہے"۔ اور جب تک انسان اس مردے کو پوجتا رہے گا وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا رہے گا۔ اور ارتقا میں آگے کی طرف قدم نہیں اٹھا سکے گا۔ اقبال کے لئے ناممکن تھا کہ نطشے کی طرح خدا کا منکر ہو جائے لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اقبال نے جا بجا دوسری ہستیوں سے جو آدم کا مقابلہ کیا ہے اس میں مختلف لطیف اور ظریفانہ پیرایوں میں آدم کو ترجیح دی ہے۔ اقبال جہاں خدا سے بھی آدم کا مقابلہ کرتا ہے تو خدا کی خدائی پر ایک چوٹ کر جاتا ہے ۔

نوائے عشق را ساز است آدم | کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت | مگر با ایزد انباز است آدم

خدائی اہتمام خشک و تر ہے | خداوندا خدائی درد سر ہے
مگر یہ بندگی استغفر اللہ | یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

"تو شب آفریدی چراغ آفریدم" والی نظم میں بھی انسان کو خدا کی تخلیق و تکوین پر اضافہ کرنے والا قرار دیا ہے۔ خدا کے تصور کے متعلق ایک خیال اسلامی اور مغربی آزاد رو مفکرین میں ملتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر تراشا ہے اور انسان اپنا ہر جو اپنی ہی صورت پر تراشتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا یہی خیال اسلامیات میں بھی ملتا ہے کہ خلق الانسان علی صورتہٖ اس کو ایک اسلامی شاعر نے الٹ دیا اور اس رنگ میں بیان کیا کہ معبود انسان ست، کہہ رہا ہے کہ :۔

مرا بر صورت خویش آفریدی | برون از خویشتن آخر چہ دیدی

اسی قبیل کا یہ مشہور فقرہ غالباً والٹیر کا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا اور انسان نے اس احسان کے بدلے میں یہ کیا کہ خدا کو اپنی صورت پر ڈھال لیا۔ پیام مشرق میں اسی مضمون کا ایک قطعہ ہے۔

تراشیدم صنم بر صورت خویش! بشکل خود خدا را نقش بستم

مرا از خود برون رفتن محال است بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اقبال نطشے کی طرح خدا کا انکار تو نہیں کرتا لیکن خدا کے ساتھ بے تکلفیاں اور بعض اوقات گستاخیاں بہت برتتا ہے۔ اقبال کی مشہور اردو نظم شکوہ، اسی قسم کی شوخیوں کا نتیجہ ہے۔ جلال الدین رومی میں جہاں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں وہ بھی اقبال کو اس درجہ پسند ہیں کہ بعض اوقات بغیر مانگے کے لے کر اپنا لیتے ہیں۔ مولانا روم کا ایک مشہور شعر ہے:۔

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اس مضمون کو اقبال نے اس مصرع میں ادا کیا ہے کہ:۔

یزداں بکمند آور اے ہمّت مردانہ

یہ سرقہ نہیں ہے اور محض مضمون اڑا لیجانے کا قصہ نہیں ہے۔ اس سے اقبال و رومی کی طبیعتوں کی ہمرنگی پائی جاتی ہے۔ خدا کی محبت، خدا تک رسائی، خدا کی عبادت یہ تمام مضامین مذہب اور فلسفۂ مذہب کے عام اور قدیم مضامین ہیں لیکن انسانوں کو یہ تعلیم دینا کہ پیغمبروں اور فرشتوں اور خود خدا کا شکار کرو ایک انوکھا نقطۂ نظر ہے۔ رومی نطشے اور اقبال تینوں کی جرأت اس بارے میں حیرت انگیز ہے۔ یہ شاعرانہ اور صوفیانہ تعلّی کی طامات بافی سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس مضمون کو کہ انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ انسان خدا کو تلاش کرے، اقبال نے الٹ دیا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے اپنی تلاش کرے اس کے لئے یہ راستہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ خدا ہم در تلاش آدمی ہست، اکثر مذاہب کی یہ تعلیم تھی کہ انسان تقدیر کی نوشت یا کرم کی کڑیوں سے پابزنجیر ہے لیکن رومی اور اقبال دونوں نے تقدیر کے مفہوم کی نئی تعبیر کی ہے۔ ان دونوں کے نزدیک رُوحِ انسانی خود اپنی تقدیر کی معمار ہوسکتی ہے۔ مومن خود تقدیر الٰہی ہے۔ جب وہ خود بدل جاتا ہے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے مولانا روم نے قد جف القلم کی ایک بلیغ تفسیر کی ہے۔ تقدیر کا قلم خشک ہوچکا ہے، جو مقدر تھا مقرر ہوچکا ہے اور اس میں کوئی کاٹ چھانٹ یا اضافہ نہیں ہوسکتا اس سے عام طور پر یہ مراد لیجاتی ہے کہ ہر شخص کے اعمال پہلے ہی سے مقرر ہیں، جو خیر و شر انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے

انسان کے اعمال سزا و جزا کے مستوجب ہیں اس انداز فکر سے نہ صرف منطقی تناقض واقع ہوتا ہے بلکہ اخلاقی ذمہ داری کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ بغیر اختیار حقیقی کے اخلاقی ذمہ داری ایک مہمل چیز ہے مولانا روم فرماتے ہیں کہ جس کو تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں قوانین حیات کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قانون قانون نہیں ہو سکتا جب تک وہ تبدیلی اور تلوّن سے مبرا نہ ہو مولانا فرماتے ہیں کہ تقدیر کا اٹل ہونا صحیح ہے سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ اگر تم چوری کرو گے تو تم پر اور جماعت پر فلاں فلاں نتائج منتج ہونگے سچ بولو گے تو فلاں فلاں قسم کی صلاح و فلاح اس کا نتیجہ ہوگی خدا نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چوری کراتا ہے اور نہ کسی کی زبان کو ہلا کر اس سے سچ یا جھوٹ بلواتا ہے۔ عمل اختیار سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج تقدیری یعنی آئینی ہیں جو فطرت انفس و آفاق میں غیر متبدل ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفوس میں تغیر پیدا نہ کرے۔ خدا نے یہاں اپنے عمل کو اقوام کے اختیاری عمل پر مشروط قرار دیا ہے اور اس طرح ایک اٹل قانون حیات بیان کیا ہے۔ جو ارادوں کو آزاد چھوڑنے کے باوجود تقدیر مبرم کی طرح کام کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں جا بجا اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں اور فلسفہ اسلام پر اپنے مدراس والے لیکچروں میں بھی اقبال نے اس مفہوم پر استدلال کیا ہے۔

بیائے خود مزن زنجیر تقدیر تہ ایں گنبد گردان رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب کہ چوں پا واکنی جولانگہے ہست

اقبال ایک نئے آدم کی تعمیر ممکن سمجھتا ہے جو اپنے لئے نیا جہاں اور نئی تقدیر پیدا کرے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تو بدل جائے تو یہ عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بھی بدل جائے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے لامتناہی ارتقا کا کوئی پہلے سے بنا بنایا نقشہ کسی لوح پر محفوظ نہیں ہے۔ زندگی جیسے جیسے تخلیقی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے وہ اپنی تقدیر خود ڈھالتی جاتی ہے :-

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد است اسیر عالم کون و فساد است
ولے فطرت ز اعجازے کہ دارد بنائے بحر بر جوشے نہاد است

زندگی طائر بام ہے، طائر زیر دام نہیں۔ انقلاب صبح و شام گردش ایام میں بھی ہے اور نفوس میں بھی۔ سوہان قضا اور فسان تقدیر سے شمشیر حیات تیز ہو کر اپنا راستہ خود کاٹتی جاتی ہے مذہب کے علاوہ فلسفے سے بھی اقبال کو یہ شکایت ہے کہ وہ عقل پرستی سے ہٹ کر ابھی خود پرستی تک نہیں پہنچا۔ فلسفہ بھی تقلیدی مذہب کی طرح جسور و غیور نہیں۔ حکماء نے بہت کچھ توہم شکنی کی لیکن ابھی تک قوت عشق سے قوت تکوین پیدا کرنے والے خود شناس آدم تک نہیں پہنچے، ابھی تک سومنات ہست و بود میں بت پرستی کر رہے ہیں خدا فرشتوں اور دیوتاؤں

پر وہ اپنی کمند کہاں پھینک سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "ہنوز آدم بہ نخچیر اے نہ بستند"

جو شخص عام معنوں میں تقدیر کا قائل نہیں وہ بھلا تقدیر کا کہاں پرستار ہو سکتا ہے۔ جو شخص خدا سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا ہے وہ بندوں کے نقش قدم کی پوجا کہاں کرے گا۔ اقبال تقلید کا اس قدر دشمن ہے کہ آزادی سے گناہ کرنے کو تقلیدی نیکی سے بہتر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ :۔

چو از دست تو کارِ نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اس انداز کے مضامین نطشے اور رومی دونوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس مضمون پر اقبال سے گفتگو ہوئی میں نے عرض کیا کہ مثنوی مولانا روم میں ایک عجیب و غریب مصرع ہے مولانا نے سکون و جمود کا مقابلہ فعلیت سے کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "کوشش بیہودہ بہ از خفتگی" یہ مصرع سن کر اقبال کا چہرہ روشن ہو گیا اور اس کی خوب داد دی اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں تقلید کو خودکشی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد اس نے بار بار تمام عمر اس مضمون کی طرف عود کیا۔

تا کجا طوف چراغ محفلے
ز آتش خود سوز اگر داری دلے

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم !!
اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر !!

پیام مشرق میں ایک رباعی ہے :۔

اگر آگاہی از کیف و کم خویش   یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزہ مہتاب تا کے ؟   شبے خود را برافروز از دم خویش

خودی کا پیغمبر بھلا تقلید کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ کسی کے بتانے پر وہ خدا کا بھی قائل ہونا نہیں چاہتا۔ وہ ایسے مرد آزاد کا متلاشی ہے جو نور خودی سے خدا کو دیکھے۔ جو انسان کو ضمیر کن فکاں سمجھتا ہے وہی اس جرأت سے کہہ سکتا ہے کہ :۔

قدم بے باک تر نہ در رہِ زیست   بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

زمین ہمارا ہی میخانہ ہے، فلک ہماری ہی گردش پیمانہ ہے اور جہاں ہمارا ہی دیباچۂ افسانہ ہے۔ جس ہستی کا جوہر تخلیق ہے، تقلید اس کے لئے موت کے مرادف ہے۔ جب کسی فرد یا قوم میں قوت تخلیق کی کمی واقع ہوتی ہے اور قوائے حیات کمزور پڑ جاتے ہیں تو وہ آسان سمجھ کر تقلید کو اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں تقلید کی پرستاری ہے وہاں سمجھنا چاہیئے کہ زندگی شبستان عدم میں جا کر سو گئی ہے اس مضمون میں اقبال نے کسی قدر گراں

کی بھی ہمنوائی کی ہے جس کی فلسفہ کا لب لباب یہ ہے کہ زندگی تغیر اور تخلیق ہے اور زندگی کے جن پہلوؤں میں تقلید اور ثبات نظر آتا ہے وہاں زندگی ایک موج بیتاب نہیں رہی بلکہ مادہ اور جسم اور ریاضیات ہو گئی ہے۔ مادے اور جسم کی حرکتیں ایک ہی آئین میں پابہ زنجیر ہو جاتی ہیں اور ریاضیات کی طرح ان میں جبر پیدا ہو جاتا ہے۔ مفصلہ ذیل مضمون برگساں ہی کی زبان میں بیان ہوا ہے۔

بجان من کہ جان نقش تو انگیخت　　　ہوائے جلوہ این گل را دو رو کرد!

ہزاراں جلوہ دارد جان بے تاب　　　بدن گردد چو یک شیوہ خو کرد!

اقبال کے ہاں اکثر جگہ خودی کی تقویت کا مضمون تقلید سے گریز کرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ تمام اکابر مصلحین نوع انسان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مقلد نہیں تھے، وہ آزادی سے نئی راہیں پیدا کرتے رہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ پیروؤں نے ان کی حریت آفریدہ تعلیم کو تقلید کا حصن حصین بنالیا۔ پیغمبروں کے رستے پر چلنے والا حقیقت میں وہ شخص ہے جو تقلید شکن ہے اکثر افراد اور اقوام کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی یا موہوم ماضی سے ایسے پابزنجیر ہوتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور وہ لکیر کے فقیر ہو کر رہ جاتے ہیں ایسی قومیں جب استبداد کے شکنجے میں جکڑی جاتی ہیں تو ان کے نام نہاد مصلح اپنی ذلت اور پستی کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ لوگوں میں آزادہ روی پیدا ہو گئی ہے اور تقلید کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ جب تک گری ہوئی قومیں اپنے ماضی سے جکڑی رہتی ہیں ان کے لئے نئی زندگی پیدا کرنا دشوار بلکہ محال ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اقبال نے بڑی آزادی سے بیان کیا ہے:۔

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے　　　زبند پاستاں آزاد رفتے!

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　　پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

پیام مشرق میں اقبال نے دو تین جگہ نطشے پر کچھ اشعار لکھے ہیں ایک نظم شوپن ہائر اور نطشے پر ہے جس میں دونوں کے فلسفوں کا مقابلہ ایک تمثیل سے کیا ہے۔ شوپن ہائر کا فلسفہ فلسفۂ یاس ہے بعض فلسفوں اور بعض مذہبوں میں زندگی کے متعلق قنوط کا رنگ غالب رہا ہے لیکن شوپن ہائر کے فلسفے میں قنوطیت کی اساس ایسی استوار کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک مستقل نظریۂ حیات بن گئی۔ شوپن ہائر کے نزدیک زندگی کے تمام مظاہر ایک عالمگیر کورانہ ارادے کی پیداوار ہیں ایک تاریک اور بے مقصد ارادۂ حیات ہر طرح وجود پذیر ہونے میں کوشاں ہے رنج اور مصیبت دکھ اور درد اس کی لازمی پیداوار ہیں۔ چونکہ ایک اندھا ارادۂ زندگی کی اصل ہے اس لئے اس کا کوئی علاج ممکن

نہیں تہذیب اور علم کی ترقی سے بجائے صلاح و فلاح کی ترقی کے دکھ کی ترقی ہوتی ہے۔ تنازع للبقا زندگی کی نفسا نفسی ہے جو شجر اور حجر، حیوان اور انسان سب کے لئے بیتابی کا باعث ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں پیکار اور رنج و محن کا بازار گرم ہے۔ شوپن ہائر کا خیال تھا کہ بدھ مت اور ویدانت کی بھی یہی تعلیم ہے۔ فرار عن الحیات، زندگی کی کشمکش سے نکل جانا سب سے اعلیٰ اور صحیح مقصد ہے۔

نطشے اور شوپن ہائر کے فلسفوں میں بعض اہم اساسی نظریات مشترک پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک ارادۂ حیات زندگی کی اصل ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ شوپن ہائر کے نزدیک زندگی محض زندہ رہنے کی کوشش ہے اور ہر وجود محض اپنی بقا کے لئے ساعی اور دوسروں کے لئے برسرِ پیکار ہے۔ نطشے نے اس میں یہ ترمیم کی کہ زندگی محض بقا کی کوشش نہیں بلکہ حصول قوت کی کوشش ہے ہر کوشش کسی نہ کسی رنگ میں اضافۂ قوت کی کوشش ہے زندگی اس لحاظ سے بے مقصد نہیں کیونکہ حصول قوت اس کا مطمح نظر ہے اس کو دکھ اور سکھ کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیئے قوت اور کمزوری کے سود و زیاں کے علاوہ باقی سب قسم کے سود و زیاں اور نفع و ضرر بے معنی ہیں زندگی کی مشکلات کا حل اس سے فرار نہیں بلکہ اپنی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے ہر رکاوٹ ایک دعوت عمل ہے زندگی سے بھاگنے کے بجائے اس میں ھل من مزید کا اصول کارفرما ہونا چاہیئے۔ زندگی اب تک ارتقا کے جو مدارج طے کر چکی ہے اس سے آگے لامتناہی مدارج اور بھی ممکن ہیں۔ اخلاق کہن اور ادیان کہنہ کا پیدا کیا ہوا توہم پرست اور لذت پرست اور غیر پرست انسان محض ایک پل ہے جس پر سے گذر کر مافوق الانسان کی طرف بڑھنا لازمی ہے زندگی پر آنسو بہانے والوں کے بجائے بہادر اور دلیر انسان پیدا ہونے چاہئیں۔ جو موجودہ انسانوں کی طرح سست عناصر نہ ہوں نفی حیات کے تمام مذاہب اور فلسفے غلط ہیں۔ فقط وہی نظریۂ حیات صحیح ہے جس میں اثبات حیات اور ذوق نمو ہے۔ قنوط زندگی کی ایک بیماری ہے۔ صحیح عناصر کا انسان پیکار حیات سے خوش رہتا ہے اور سیلاب کوہسار کی طرح رکاوٹوں پر رقص کرتا ہوا چلتا ہے۔ شوپن ہائر اور نطشے کی نظریات حیات کے اس تفاوت کو اقبال نے اس نظم میں ادا کیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

مرغے ز آشیانہ بہ سیرِ چمن پرید | خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

ایک مرغ اپنے گھونسلے سے سیر بوستاں کے لئے اڑا، پھول سے لذت اندوز ہونا چاہتا تھا، لیکن ایک کانٹا اس کے نازک بدن میں چبھ گیا وہ نہ صرف نہ اپنے درد سے کراہا بلکہ چمن روزگار کی فطرت کو برا کہنے لگا۔ گل کو بھی اور خار کو حقیقی سمجھنے لگا۔ اس کو ذکی الحس ہونے کی وجہ سے تمام مرغان چمن کا درد جگر محسوس ہونے لگا۔ لالہ کے

اندر اس کو کسی بے گناہ کے خون کا داغ دکھائی دینے لگا۔ گل کو چاک پیرہن اور عندلیب کو نوحہ گر سمجھا بہار کو سیمیا اور جوئے آب کو سراب تصور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تمام چمن کی اساس فریب اور رنج و محن پر ہے۔ اس درد جانکاہ سے اس نے ایسا نالہ کیا کہ اس کی نوا خون بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑی حسن اتفاق سے ایک ہد ہد نے اس کی آہ و فغاں کو سنا اس کو رحم آیا اور اس کا کانٹا اپنی منقار سے نکال دیا اور اس کو نصیحت کی کہ آہ و نالہ نہیں کرنا چاہیئے۔ زندگی کی اصل یہ نہیں لیکن اس کی فطرت یہ ہے کہ اس میں گوہر سود جیب زیاں کے اندر رہتا ہے۔ گل اپنے شگاف سینہ سے زر ناب پیدا کرتا ہے۔ درد آشنا ہونا بھی درد کا علاج ہے اگر تو کانٹوں کا خوگر ہو جائے تو خود سراپا چمن بن جائے۔

پیام مشرق میں ایک اور نظم نطشے پر ہے جس کے نیچے اقبال نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا ہے جو مفصلہ ذیل ہے۔

"نطشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لئے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں۔

قلبِ او مومن دماغش کافر است

نبی کریم صلعم نے اسی قسم کا جملہ امیہ ابن الصلت عرب شاعر کی نسبت فرمایا تھا "آمن لسانہ وکفر قلبہ"

یہ فقط چار اشعار کی ایک چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس میں ہر شعر نطشے کے فلسفے کے کسی ایک پہلو کا صحیح آئینہ ہے اس کے علاوہ ان اشعار میں اقبال نے اپنا زاویہ نگاہ نطشے کی تعلیم کی نسبت بڑی خوبی سے پیش کر دیا ہے اور ضمناً یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام کی تعلیم سے اس کی تعلیم کو کس قسم کا تعلق ہے۔

گر نوا خواہی ز پیش او گریز — در نئے کلکش غریو تندر است

نیشتر اندر دل مغرب فشرد — دستش از خون چلیپا احمر است

آں کہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت — قلبِ او مومن دماغش کافر است

خویش را در نار آں نمرود سوخت
زاں کہ بستان خلیل از آذر است

اس کی آواز ایک کڑکا اور ایک گرج ہے۔ شیریں نوا کے طالب کو اس سے گریز کرنا چاہیئے اس کی صریر قلم تلوار کی جھنکار ہے۔ عیسائیت کے خون سے اس کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنا بت خانہ اسلام کی بنیادوں

پر قائم کیا۔ اس کا دل مومن ہے اور دماغ کافر تو اس نمرود کی آگ میں بے دھڑک داخل ہو جا۔ اگر تجھ میں ایمان خلیل ہے تو تو جلے گا نہیں بلکہ یہی آگ تیرے لئے بوستان بن جائے گی۔

یہ اشعار کسی قدر مزید تشریح کے طالب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نطشے نے مسیحیت پر جو حملہ کیا اس کی بنا کیا تھی؟ آزاد خیال لوگوں، سائنسدانوں نے عقلیت کے پرستاروں نے دہریوں اور ملحدوں نے نطشے سے قبل اور نطشے کے بعد عیسائیت پر کئی طرف سے حملے کئے ہیں لیکن نطشے نے جس پہلو سے حملہ کیا ہے اور جس جرأت سے حملہ کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کسی نے کلیسا کے استبداد اور حریت کشی پر حملہ کیا ہے کسی نے معجزات اور کرامات پر کسی نے مسیح کی پیدائش اور موت کے افسانوں کو جھٹلایا، لیکن مسیحیت کے خلاف اور اس کے نظریۂ حیات کو کسی نے اس طرح انسانیت اور ارتقاء کا دشمن قرار نہیں دیا جس طرح کہ نطشے نے۔ وہ مسیحیت کو غلاموں کی ایک بغاوت قرار دیتا ہے جس نے شجاعانہ اور آقایانہ اخلاق کی تمام اقدار کو تہ و بالا کر دیا، یونان اور روما کی تہذیب کے بہترین عناصر اس سے تباہ ہو گئے اور ارتقائے حیات میں ایک بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تمام انسان مساوی ہیں تمام انسان گنہ گار پیدا ہوتے ہیں عقل اور علم کے مقابلے میں جہالت خدا کو زیادہ پسند ہے۔ غلام آقا سے بہتر ہے۔ جنت مفلسوں، ناداروں اور کمزوروں کے لئے ہے۔ قوت گناہ ہے اور عجز سب سے بڑی نیکی ہے، جسم یہ مادہ اور یہ دنیا ذلیل ہے اور بعد میں آنے والی دنیا اصل ہے، نطشے کے نزدیک اس قسم کی تعلیم غلاموں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے اور غلاموں ہی کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ اور غلام ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کی داد دے سکتے ہیں جب تک انسان اس تعلیم کو بیخ و بن سے نہ اکھاڑ دے وہ جسمانی اور روحانی موت میں سے نہیں نکل سکتا نطشے کا یہ حملہ مسیحیت پر اسی زاویۂ نگاہ سے کیا گیا ہے جس زاویۂ نگاہ سے اسلام نے مسیحیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا "لا رہبانیت فی الاسلام" اسی نقطۂ نظر کے خلاف جہاد کا اعلان تھا نطشے نے مذاہب کی جو تقسیم کی ہے کہ مذاہب فقط دو قسم کے ہیں اثبات حیات کے مذاہب اور نفیٔ حیات کے مذاہب، یا خود نطشے کے الفاظ میں زندگی کو "ہاں" کہنے والے اور زندگی کو نہیں کہنے والے، اس تقسیم میں بدھ مت اور مسیحیت زندگی کو "نہیں" کہنے والوں میں ہیں اور اسلام زندگی کو "ہاں" کہنے والوں میں۔ نطشے کسی مذہبی تعلیم سے اس حقیقت تک نہیں پہنچا وہ مذہب سے بیزار ہے اور مذہب کے خدا سے بھی بیزار اور اس کا منکر، باوجود اس کے اس کی نظر فطرت حیات کے متعلق ایسی صحیح ہے کہ بقول اقبال وہ کافرانہ انداز سے اسلام کے زاویۂ نگاہ پر آ گیا ہے۔ اقبال کو نطشے کی تعلیم کا وہی پہلو پسند ہے جو اسلام کی تعلیم کا ایک امتیازی عنصر ہے۔ اسلام کے اس پہلو سے متاثر ہونے کی وجہ سے اقبال نے نطشے کا اثر قبول کیا۔ اسلام نے جہاد کو ایمان کا ثبوت

اور کہا کہ جہاد ہی اس امت کی رہبانیت ہے۔ زندگی باوجود اس کی کلفت اور کشاکش کے اسلام کے نزدیک ایک نعمت ہے جس میں قوت اور جمال پیدا کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے۔ اسلام نے فطرت کو صحیح سمجھا اور اپنے آپ کو عین فطرت قرار دیا اور کہا کہ انسان اسی فطرت پر خلق کیا گیا ہے۔ ارتقائے حیات، علوِ آدم، تسخیر فطرت، احترام حیات، جسم اور مادے کو روحانیت کا معاون سمجھنا، حصول قوت کی کوشش، یہ تمام چیزیں اسلام اور نطشے کی تعلیم میں بہت حد تک مشترک ہیں گو انداز بیان بہت مختلف ہے۔ اسلام ان تمام نظریوں کو توحید کے عقیدے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور انھیں اسی عقیدے کے مشتقات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نطشے نہ خدا سے شروع کرتا ہے اور نہ خدا پر ختم کرتا ہے۔ اس کی نظر فقط فطرت اور انسان کے ممکنات تک محدود ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی نظر جاتی ہے وہاں تک صحیح ہے۔ اقبال کو نطشے کا کفر بھی بہت ناگوار نہیں ہے سست مومن سے جری کافر بہتر ہے کسی صوفی شاعر کا ایک مشہور شعر ہے جو نطشے کی آواز معلوم ہوتا ہے ؎

خود را نہ پرستیدہ عرفاں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذّت ایماں چہ شناسی

اقبال کو نطشے کی ظلمات کفر چشمۂ حیات کی طرف لیجانے والی تاریکی معلوم ہوتی ہے اس کے قلب کا مومن ہونا اقبال کے لئے ایسا دلکش ہے کہ اس کے دماغ کے کافر ہونے سے وہ نہیں گھبراتا۔ اقبال کے فلسفے میں اصل چیز دل ہے۔ دماغ نہیں، روحِ حیات عشق ہے عقل و استدلال نہیں اور عشق کا کام آزادی اور تخلیق اور علو درجات، تسخیر کائنات اور ارتقائے لامتناہی، یہ سب چیزیں نطشے کے افکار پریشاں میں بڑی کثرت سے ملتی ہیں اقبال کے نزدیک نطشے ایک دیوانہ ہے جو شیشہ گروں کی کارگاہ میں لٹھ لے کر گھس گیا ہے اور تمام سامانِ فریب کو اس نے چکنا چور کر ڈالا ہے۔ اگر اس کا لٹھ کچھ مقدس ظروف پر بھی پڑ گیا ہو تو قابل معافی ہے۔

جاوید نامے میں اقبال مولانا روم کی رہبری میں جب آں سوئے افلاک پہنچ گیا تو ایک مقام پر نطشے سے بھی ملاقات ہوئی اقبال رومی اور نطشے کا عالم خیال میں ایک مقام پر جمع ہو جانا خود اقبال کی نفسی ترکیب پر روشنی ڈالتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تینوں آں سوئے افلاک نہیں۔ بلکہ ایں سوئے افلاک خود اقبال کے دل کے اندر جمع ہیں لیکن خود دل کی حقیقت اگر آں سوئے افلاک ہے تو یہ مقام ملاقات بالکل صحیح ہے۔ کسی کا ایک بڑا بلیغ شعر ہے ؎

دل منزل خود آں طرف ارض و سما داشت
وہم است ترا ایں کہ بہ پہلوئے تو جا داشت

اقبال نے نطشے سے متاثر ہو کر بہت سے اشعار لکھے ہیں اور خود نطشے پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں اور ان میں اس کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس نظم میں اس نے نطشے کے متعلق ایک انوکھا پہلو اختیار کیا ہے جو فقط وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جو اسلامی تصوف اس کی نفسیات اور اس کی تاریخ سے آشنا ہو۔ نطشے اپنی عمر کے آخری حصے میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ آج تک سوانح نگاروں اور نقادوں میں یہ بحث چلی جاتی ہے کہ آیا دیوانگی کے بالکل ظاہر اور نمایاں ہو جانے سے قبل بھی وہ نیم دیوانہ تھا یا نہیں۔ اس کی تصانیف میں جو بے ربطی اور تناقض اور کیفیات کے انقلاب پائے جاتے ہیں ان کو اسی امر پر محمول کیا جاتا ہے کہ ہر وقت اس کے ہوش ٹھکانے نہیں ہوتے تھے۔ وہ مسلسل اور منظم انداز سے سوچ نہیں سکتا تھا اس کا تخیل دیوانگی کی وجہ سے بے عنان ہو جاتا تھا اور اس کے جذبۂ حیات کی یہی کیفیت تھی جس کو غالب نے اس مصرعے میں بیان کیا ہے :۔

شوخ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

اقبال نے اسلامی تصوف کی نفسیات کے ماتحت نطشے کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ مجذوب تھا، مجنون نہیں تھا مجذوب اور مجنون کی یہ تفریق مغرب کی نفسیات اور طب میں موجود نہیں اقبال نے نطشے کی کیفیت نفسی کو مجذوبیت کے ماتحت بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس کو حلاج بے دار و رسن کہتا ہے۔ منصور نے بھی حق کو انائے انسانی میں ضم کر دیا تھا اس کے زمانے کے ملاؤں اور فقیہوں نے اس کو کافر قرار دے کر مصلوب کر دیا لیکن جب تصوف کی چاشنی عالم اسلام میں عام ہو گئی اور ہر ملا اور عالم کو صوفی بننے یا صوفی کہلانے کا شوق ہوا تو منصور کا درجہ اس قدر بلند ہوا کہ تصوف اور متصوفانہ شاعری میں وہ بلندیٔ نظر حقیقت عرفاں اور اتصال الی الحق کی مثال بن گیا اقبال کے نزدیک نطشے کا حق کو انسان کامل یا فوق الانسان کا مرادف قرار دینا وہی حلاج ہی کی قسم کی بات تھی لیکن انداز گفتار میں فرق تھا۔

باز ایں حلاج بے دار و رسن — نوع دیگر گفت آں حرف کہن
حرف او بے باک و افکارش عظیم — غربیاں از تیغ گفتارش دو نیم

اقبال کو اس کا افسوس ہے کہ عشق و مستی سے بے نصیب عاقلان فرنگ نے اس کی نبض طبیب کے ہاتھ میں دے دی، اس کا علاج ابن سینا سے نہیں ہو سکتا تھا اس کے لئے کسی مرشد کامل اور مرد راہ داں کی ضرورت تھی جس کے ظہور کے لئے مغرب کی عقلیت کی سرزمین موزوں نہیں، اس کے لئے جوش حیات کو صحیح راستہ نہ مل سکا اس لئے اس نے ایک زلزلے اور سیلاب کی صورت اختیار کر لی اس کی شراب اپنی تیزی کی وجہ سے

مینا گداز ہوگئی۔ اس کا نغمہ اس کے تارِ چنگ سے افزوں ہوگیا۔ اس کے سوز نے ساز کو توڑ ڈالا۔

عاشقے در آہ خود گم گشتۂ　　　صادقے در راہ خود گم گشتہ

مستی او ہر زجاجے راشکست　　　از خدا ببرید و ہم از خود گسست

وہ جمال و جلال قاہری اور دلبری کا اختلاط چاہتا تھا۔ صحیح ترکیبِ امتزاج سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے قاہری دلبری پر اور جلال جمال پر غالب آگیا۔ سالک راہ شناس نہ ہونے کی وجہ سے وہ راستہ بھول گیا۔ پہلے وہ خدا سے منقطع ہوا، اس کے بعد اپنے آپ سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ جو کیفیت معراجِ قلب سے پیدا ہوتی ہے اس کو وہ آب و گل کے ارتقا میں تلاش کرتا تھا۔ وہ عروجِ نفس میں مقامِ کبریا ڈھونڈھتا تھا لیکن اس مقام کو عقل و حکمت کے ذریعے سے تنازع للبقا میں تلاش کرتا تھا۔ جہاں تک نفیِ ماسوا کا تعلق ہے وہ صحیح راستے پر تھا لیکن استحکامِ خودی میں لا سے اِلّا کی طرف قدم نہ اٹھا سکا، نفی میں گم ہوگیا۔ اثبات تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ تجلی سے ہم کنار تھا لیکن بے خبر تھا۔ موسیٰ کی طرح وہ بھی طالب دیدار تھا لیکن دیدارِ الٰہی کی طلب سے اِدھر اُدھر دیدارِ آدم کی طلب میں رہ گیا۔ اگر شیخ احمد سرہندی کی قسم کا مرشد روح کے احوال و مقامات سے واقف اس کو مل جاتا تو وہ رویتِ الٰہی تک اس کو پہنچا تا لیکن افسوس کہ وہ اپنی عقل ہی کے بھنور میں چکر کھاتا رہا۔ اس نظم میں اقبال نے نطشے کے متعلق افسوس کیا ہے کہ وہ مرشد کامل نہ مل سکنے کی وجہ سے سالک ہونے کے بجائے مجذوب ہوگیا۔ کاش کہ اس کو کوئی ایسا مرشد مل جاتا۔

بال جبریل میں ایک غزل میں نطشے کی نسبت اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کو خیال ہوتا ہے کہ میں خود بھی اس کا مرشد بن سکتا تھا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں

تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اس شعر پر اقبال نے ایک نوٹ لکھا ہے۔ وہ جرمن کا مشہور مجذوب فلسفی نطشے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔

بال جبریل میں صفحہ ۱۲۲ پر یورپ کے عنوان کے تحت دو اشعار ہیں جن میں اقبال نے نطشے کے اس خیال کو نظم کیا ہے کہ اگر یورپ میں اور کچھ عرصے تک سرمایہ داری کا دور دورہ رہا تو تمام یورپ یہودیوں کے پنجۂ اقتدار میں آجائے گا۔

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار　　جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح　　دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

آزادیٔ افکار کے خطرے کے متعلق بالِ جبریل میں جو نظم ہے اس میں بھی اقبالؒ نے نطشے ہی کے اس خیال کو اپنے خاص رنگ میں بیان کیا ہے کہ آزادیٔ افکار فقط بلند قسم کے انسانوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔ دونی فطرت اور بے ضبطیٔ قلب کے ساتھ آزادیٔ افکار تباہی کا باعث ہوگی۔ ضربِ کلیم میں صفحہ ۴ پر مہدیٔ برحق کے متعلق اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں اس میں ایک طرف اس زمانے کے بعض سست عناصر مدعیانِ نبوت ہیں جو حقیقی نبوت کے راستے ہی پر نہیں پڑے ایسوں کو اقبال **مسیلمہ** ہی سمجھتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر نطشے پر بھی ہے۔ اس کو وہ جھوٹا نہیں سمجھتا بلکہ بھٹکا ہوا نبی خیال کرتا ہے۔ مہدیٔ برحق کے لئے وہ ایک شرط یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ زلزلۂ عالمِ افکار ہو محض دینیاتی مناظرے کرنے والا کتاب ساز اور کتاب فروش نہ ہو نہ مقلد ہو اور نہ محض افکارِ کہن کا مجدد زلزلۂ عالمِ افکار لکھتے ہوئے یقیناً نطشے اقبال کے مدِ نظر ہے۔ اقبال کی گفتگو میں بھی جب جدید زمانے کے مدعیانِ نبوت کا ذکر ہوتا تھا تو نطشے کو بھی اس فہرست میں داخل کیا جاتا تھا اگرچہ نطشے نے کوئی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی امت بنانا چاہی۔

باوجود مداحی اور اثر پذیری کے حقیقت ہے کہ اقبال کبھی نطشے کا پورے طور پر پیرو نہیں رہا نطشے کے افکار کا ایک حصہ اقبال کو بہت حیات افروز معلوم ہوا کچھ تو نطشے کا فلسفۂ خودی اقبال کی اپنی طبیعت کے موافق تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ اپنی ہمت باختہ قوم کے احیا کے لئے وہ اس حربے سے کام لینا چاہتا تھا اقبال نے بہت سے حکماء و صوفیا سے فیض حاصل کیا لیکن اپنے فلسفۂ خودی کے مطابق وہ پوری طرح کبھی کسی کا مقلد نہیں ہوا۔ ہر بڑے مفکر کے ساتھ وہ کچھ دور تک چلتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کو چھوڑ کر پھر اپنی راہ پر پڑ جاتا ہے۔

اسرارِ خودی میں جو اثرات مغربی فلسفے کے نمایاں ہیں ان میں صرف نطشے ہی کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ المانوی فلسفی فشٹے اور فرانسیسی یہودی فلسفی **برگساں** کے افکار بھی ملتے ہیں خودی کے فلسفے کی اساس میں صفحہ ۱۱ پر جو اشعار ہیں وہ فشٹے سے ماخوذ ہیں جس کا فلسفہ یہ تھا کہ عین ذات یا حقیقت وجو ایک انائے ساعی ہے، عمل اس کی فطرت ہے اخلاقی عمل اور پیکار اور نشوونما کے لئے اس نے اپنا غیر یا ماسوا پیدا کیا تاکہ امکانِ پیکار او راس کے ذریعے سے امکانِ ارتقا ممکن ہوجائے اس فلسفے کو جوں کا توں اقبال نے اپنے بلیغ و رنگین انداز میں اس طرح بیان کردیا ہے کہ فلسفے کا خشک صحرا گلزار ہوگیا ہے۔ مفصلہ ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است — خویشتن را غیرِ خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
می کشد از قوتِ بازوئے خویش — تا شود آگاہ از نیروئے خویش
خود فریبی ہائے او عینِ حیات — ہمچو خون از گل وضو عینِ حیات
بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند — از پئے یک نغمہ صد شیون کند

عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی — خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغِ یک محمد برفروخت

یہ سب نطشے کا فلسفۂ انا اور فلسفۂ حیات ہے۔ جہاں تک افکار اقبال کی اساس کا تعلق ہے اقبال بہ نسبت نطشے کے فشتے سے زیادہ متاثر ہے۔ فشتے کی کشمکش حیات میں اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے جو نطشے میں اس قدر نمایاں نہیں۔ فشتے ایک خاص انداز کا موحد ہے اور نطشے منکرِ خدا ہے۔

اسرارِ خودی میں نطشے کے زیرِ اثر جو نظمیں لکھی گئی ہیں اب ان پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھنا چاہیئے کہ اقبال پر نطشے کا اثر کس انداز کا ہے۔ صفحہ ۲۵ پر افلاطون پر جو تنقید ہے وہ نطشے سے ماخوذ ہے۔ افلاطون اس عالمِ محسوس سے اوریٰ ایک ازلی اور ابدی غیر متغیر عالمِ عقلی کا قائل تھا اس متحرک اور متغیر اور محسوس زندگی کو مقابلتہً غیر اصلی سمجھتا تھا۔ اس کا اثر عیسوی اور اسلامی فلسفے اور تصوف پر بہت پائدار اور بہت گہرا ہے اسلامی تصوف میں جو افکار بعض اکابر صوفیا کے نام کے ساتھ منسوب ہیں وہ حقیقت میں یا افلاطون کے افکار ہیں۔ یا اس کے افکار کے مشتقات ہیں۔ محی الدین ابن عربی کی، نصوص الحکم کا بہترین حصّہ اسی سے ماخوذ ہے۔ اور فلسفۂ اشراق کی بنیاد بھی افلاطونی ہے۔ اسلامی بنیاد اور تصوف میں یہ چیزیں اس طرح سما گئیں

اور سمو ئی گئیں کہ اب ان کو اصل اسلام سے علیحدہ کرنا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا ہے یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نیٹشے کا یہ خیال تھا کہ افلاطون اور سقراط کے اثر سے جو فلسفہ اور تہذیب اور فن لطیف پیدا ہوئے ہیں وہ سب انحطاطی ہیں اور جب تک ان کا قلع قمع نہ کیا جائے اس بھٹکتی ہوئی اور ٹھٹکتی ہوئی فطرت کو اصل سمجھنا دشوار ہے۔ افلاطون کا اثر جس انداز میں عیسائیت اور مغربی علوم وفنون میں ملتا ہے۔ اس سے کچھ ملتا جلتا اثر اسلامیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ افلاطون پر نیٹشے کے انداز کی تنقید کرنے کے بعد اقبال اسلامی ادبیات کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کو عجمی ادبیات میں بھی وہ رنگ ملتا ہے جس کو وہ انحطاط کی علّت اور اس کا معلول قرار دیتا ہے جوش جہاد میں اقبال ؒ نے حافظ پر بھی حملہ کر دیا جس سے حافظ کے پرستاروں میں بہت ہل چل مچی اور انھوں نے بہت سخت الفاظ میں اقبال کے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی۔ اقبال نے حافظ کی نسبت کہہ دیا تھا کہ ؎

مار گلزارے کہ دارد زہر ناب   صید را اوّل ہمی آرد بخواب

نیٹشے کی طرح اقبال ؒ بھی اس خواب آور فن لطیف کے بہت خلاف تھا۔ افلاطون کے ساتھ اس نے حافظ کو بھی عجمی ادبیات کا نمونہ سمجھ کر ہدف تنقید بنایا لیکن قوم کے برانگیختہ ہونے سے اقبال نے اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں سے حافظ کا نام نکال دیا۔ میں نے اقبال سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ فرمانے لگے کہ خیالات میرے وہی ہیں میں نے مصلحتہً حافظ کا نام نکال دیا ہے کیونکہ اس میں خدشہ یہ ہے کہ اس مخالفت کی وجہ سے لوگ کہیں میرے نظریے ہی کے مخالف نہ ہو جائیں۔ اگر وہ حافظ کو ایسا نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں لیکن ادبیات کے متعلق میرے اس نظریے پر غور کریں۔ (باقی آئندہ)

مآلِ تہذیب

چشمِ عبرت سے بلا انگیزیٔ ایام دیکھ
بزمِ ہستی میں بپا اک حشرِ بے ہنگام دیکھ

ہو رہا ہے بحر و بر میں ہر طرف ظاہر فساد
امن سوزی کیلئے فتنوں کو بے آرام دیکھ

خود زمیں سے ہے عذابِ آسمانی کا ظہور
بیم بم سے بام و در کو لرزہ بر اندام دیکھ

ترکتازی کے عوض اب قتّازی[١] پر ہے ناز
عصرِ حاضر کی نئی شمشیرِ خوں آشام دیکھ

توپ ہے، طیارہ ہے، غوّاصہ[٢] ہے، دبّابہ[٣] ہے
ان ہلاکت خیز ایجادوں کا فیضِ عام دیکھ

بن گئی ہے شامتِ اعمال اک طوفانِ قہر
غرقِ خونِ آدمیت کشتیٔ اقوام دیکھ

کارفرما ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل
صید کو آزاد، صیّادوں کو زیرِ دام دیکھ

برق گرتی تھی جو کل کاشانۂ درویش پر
اُس کی زد میں آج امیروں کے بھی قصر و بام دیکھ

دیدنی ہے بادۂ باطل کی تندی کا اثر
میکدے میں خود بخود ٹکرا رہے ہیں جام دیکھ

جن کی جرأت کر نہیں سکتا ضمیر افراد کا
ملتوں میں اُن جرائم کا فروغِ عام دیکھ

ظلم و عصیاں میں بھی استعمال کرتے ہیں اُسے
ہو گیا ہے کس قدر ارزاں خدا کا نام دیکھ

---

[١] Blitzkrieg [٢] آبدوز کشتی [٣] ٹینک یا فولادی گاڑی

یہ بھی ہے ناپائدار اور وہ بھی ہے بے اعتبار
دوستی اور دشمنی میں شیوۂ اقوام دیکھ

پھر زمانے میں ہوائے نفس کی بنیاد پر
اک نئی دنیا بنانے کا خیالِ خام دیکھ

تجرباتِ زندگی کے شعلۂ جوّالہ سے
دودِ بیجاں کی طرح اڑتے ہوئے اوہام دیکھ

کس طرح مجبور ہو کر جھک رہی ہیں گردنیں
آستانِ کبریا پر سجدۂ اصنام دیکھ

باوجودِ حکمت و قوت قیامِ امن میں
عقلِ انسانی رہی ہے کس قدر ناکام دیکھ

جس نے لادینی پہ رکھی تھی اساسِ زندگی
اپنی آنکھوں سے اب اس تہذیب کا انجام دیکھ

فتنہ و شر کی فضائے آتشیں کے درمیاں
آج دنیا کس قدر ہے تشنۂ اسلام دیکھ

ہاں بہت سے رہبروں کو آزمایا جا چکا
نوعِ انساں! اب محمدؐ کا بھی دامن تھام دیکھ!

(اسد ملتانی)

بہ سلسلۂ اصلاح

خلق، تقدیر، کتاب اللہ (نظام الٰہی)

عنوان بالا میں تین الفاظ مختلف مادوں سے ترکیب دیئے گئے ہیں۔ خلق کا مادہ خ' ل' ق' ہے۔ تقدیر۔ ق' د' ر سے لیا گیا ہے۔ اور کتاب۔ ک' ت' ب سے بنایا گیا ہے۔

خلق کے معنے بنانا' پیدا کرنا' کسی چیز کو کسی رنگ میں ترکیب دینا یا نیست سے ہست کرنا ہے۔ تقدیر کے معنے اس چیز کو ایک موزوں صورت اور مناسب انداز (قدر۔ اندازہ) میں ظاہر کرنا۔ اور کتاب اللہ کے معنے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی کتاب (لکھی ہوئی چیز) ہے یعنی نظام الٰہی

حیوانات' جمادات اور نباتات خلق اللہ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو بنایا' پیدا کیا' ایک رنگ میں ترکیب دیا۔ یا نیست سے ہست کیا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور ہستی نے ان کو خلق نہیں کیا۔ وہی خالق ہے۔ لا الہ الا ھو لا خالق الا ھو' اس کی خالقیت میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین (شریک فی ذات الالوہیۃ یا فی صفات الالوہیۃ کرنیوالے) بھی ولئن سألتھم من خلق السموٰت والارض؟ جب تم ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین پیدا کئے؟ کہہ اٹھیں گے لیقولن اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے۔ اس کے سوا ان کا کوئی اور خالق نہیں ہے۔

اس کے بعد حیوانات کو حیوانیت اور جمادات کو جمادیت اور نباتات کو نباتیت کے لباس میں ایک موزوں صورت اور انداز میں ظاہر کیا۔ حیوان سے جماد کا کام لینا' جماد سے نبات کا یا نبات سے حیوان کا وغیرہ اس کی تقدیر اور انداز کے خلاف ہے۔ حیوان جب تک حیوان ہے حیوانیت سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ جماد جب تک جماد ہے جمادیت سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ نبات جب تک نبات ہے نباتیت سے ایک انچ نہیں سرک سکتا۔ اس کے باوجود حیوان کس کو کہتے ہیں؟ ایک چلتی پھرتی متحرک بالارادہ جاندار چیز ہے جن میں سے انسان ایک صاحب ارادہ' ذی شعور مخلوق ہے جو آنکھ رکھتے ہوئے اس سے دیکھے' کان رکھتے ہوئے اس سے سنے' زبان سے بولے' دماغ سے سوچے' ہاتھ اور پاؤں سے پکڑنے اور چلنے کا کام لے۔ آنکھ سے کان کا' کان سے آنکھ کا یا آنکھ اور کان سے زبان کا اور زبان سے دماغ

کا یا دماغ سے، ہاتھ پاؤں کا بالعکس، کام لینے کا مجاز نہیں ہے۔

اس وقت اس مضمون میں ہماری بحث صرف انسان سے ہے۔

انسان اس حیثیت سے کہ انسان ہے۔ مجبور محض ہے۔ انسان کسی اور حیوان کی شکل میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اس میں اس کا اختیار کام نہیں کر سکتا۔ انسان انسان رہنے پر مجبور ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کی اشیاء سے کام لے مختار اور صاحب ارادہ ہے جس چیز سے چاہے اپنی منشا کے مطابق کام لے۔ اپنی منشا کے استعمال میں مختار کل ہے چاہے زہر کھالے اور شہد سے اجتناب کرے اور چاہے شہد کھالے اور زہر سے اجتناب کرے مگر زہر اور شہد اپنے اپنے اثرات میں مجبور محض ہیں۔ زہر جب تک زہر ہے شہد نہیں بن سکتی اور شہد جب تک شہد ہے زہر نہیں ہوگی۔ انسان نے اپنی عقل سے کام لے کر قدرت کے ان مخفی اسرار کو بروئے کار لانے کے لئے سینکڑوں سال کے تجاربے سے کامیابی حاصل کرلی ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اگرچہ ایسے تجربے احاطہ کلی کے نام سے موسوم نہیں کئے جاسکتے۔ انسان محیط کل نہیں ہوسکتا۔ محیط تو اللہ تعالےٰ کی ذات ہے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ ان اللہ قد احاط بکل شیئ علماً اسی طرح قدرت کی دوسری اشیاء ارضی یا اجرام فلکی پر دسترس حاصل کرنے کے لئے انسان نے اپنے اختیار کو کام میں لاکر ان اشیاء کو معلوم کرنے کی سعی کی خلق لکم ما فی الارض جمیعا پانی سے پانی کا کام لیا۔ آگ سے آگ کا۔ دونوں کو ملا کر بھاپ کا۔ وغیرہ وغیرہ

مگر انسان کو انسان سے کس طرح واسطہ رکھنا چاہیئے؟ کیسی زندگی بسر کرنا چاہیئے؟ اس کے لئے خالق اور مقدر خدا نے انسان کو "الکتاب" بھیج کر رہنمائی کی۔ اور ایک انسان کو مصطفیٰ اور برگزیدہ کرکے اس کام کے لئے چن لیا کہ وہ اس کتاب کے مطابق لوگوں کو عمل کرکے دکھائے۔ اس کی اس زندگی میں لوگوں کیلئے اسوۂ حسنہ ہوگا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اس کتاب میں بتایا اور سمجھایا گیا کہ صحیح انسانیت کیا ہوتی ہے؟ انسان کو انسان سے کیا سلوک روا رکھنا چاہیئے؟ کیسی زندگی بسر کرنا چاہیئے؟ خدا تعالیٰ کی مخلوق سے کیا کام لینا چاہیئے؟ کونسی چیز میں انسان کے لئے زہر ہے اور کونسی چیز میں شہد؟ کون اعمال انسان کے لئے اچھے ہیں اور کون برے؟ مگر ان کے استعمال میں انسان اختیار کامل رکھتا ہے مجبور نہیں ہے وہ اپنی عقل میں آزاد ہے چاہے شہد استعمال کرے چاہے زہر۔ چاہے زہر سے پرہیز کرے چاہے شہد سے۔ اسے زہر اور شہد کا علم دے دیا گیا ہے۔ اور اسکے نتائج سے بھی انسان کو باخبر رکھ کر اس پر منّ اور احسان نازل کیا گیا ہے۔

یہ اس کی علمیت کا اثر ہے کہ اس نے انسانوں کو جہالت اور نادانی سے نکال کر باہر کیا اور علم کی رفیع بارگاہ میں
پہونچا دیا۔ علمک مالم تکن تعلم سکھایا تجھے جو تم نہیں جانتے۔ علمکم مالم تکونوا تعلمون سکھایا تمہیں جو تم نہیں جانتے
تھے۔ بے علمی سے علم دیا۔ ورنہ انسان بے علم، جاہل اور نادان رہ کر نا معلوم کیا کیا ستم رانیاں کرتا، زمین میں کیا
کیا فساد کرتا۔ اور سب سے بڑا فساد یہ کہ اپنے اختیار سے۔ اپنی عقل سے کام لے کر۔ . . . .
. . . . حلال کو حرام کرتا، حرام کو حلال سمجھتا، نیکی کو گناہ اور گناہ کو نیکی تصور کرتا۔ خدا کا انکار اور
طاغوت کا اقرار کرتا اور غیر اللہ کے آگے جبیں سائی کرتا۔ یہانتک کہ اپنی انسانیت کو جمادات اور نباتات کے آگے
سرنگوں کر دیتا۔ ان کو معبود من دون اللہ قرار دیتا۔ اور یہ بھی ممکن تھا اور ہے کہ ایک انسان ایک چیز کو اچھا سمجھتا تو
دوسرا اُسے برا۔ اور ایک انسان کسی چیز کو برا سمجھتا تو دوسرا اچھا۔ ایسا ہی اغراض اور شہوات کے تصادم سے ایک
انسان دوسرے کا دشمن ٹھیر کر ایک دوسرے کی تباہی کے درپے ہوتا اور ظہر الفساد فی البر والبحر کے مصداق خشکی
اور تری میں فساد ہی فساد پھیل جاتا۔ ضروری ہوا کہ اللہ تعالےٰ اپنی خالقیت اور مقدریت کے ساتھ اپنی
سبحانیت اور علیمیت کو سامنے رکھ کر اپنے بندوں پر من اور احسان نازل کرے۔ ان میں سے ایک کو منتخب کر کے
ان کے لئے اپنا رسول بنا دے اور اس کے ذریعہ چند امور اپنی طرف سے بطور نظام ان پر لکھ دے تاکہ وہ لکھی
ہوئی باتیں انسان کے لیے مشعل راہ بنیں اور ہر وقت ان کے سامنے رہیں اور خدا کی لکھی ہوئی چیز ہمیشہ اٹل
رہے گی۔ امٹ رہیگی۔ اس کو کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیگا اور نہ کوئی اس کے مٹانے کی جرأت کر سکے گا۔ یہ نظام الٰہی
کہلائیگا۔ اور دوسرے تمام نظاموں سے جن کو انسانوں نے اپنی شہوات اور خواہشات کے ماتحت خود تیار کیا ہوا
ہے۔ یہ نظام اعلیٰ اور برتر رہیگا۔ پاک اور بے عیب ہوگا۔ اور یہی نظام صحیح خلافت الٰہی اور وراثت ارضی ہے
اسی نظام میں "الحکمت" مستور ہے۔ یہی نظام "الحکم" ہے یہی نظام "العلم" ہے۔ اس کی ٹکر میں جو نظام آئے گا
پاش پاش ہوگا۔ جو طاقت مقابلہ پر ہوگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی۔ فراعنۂ زمانہ کی فرعونیت اور نماردۂ وقت کی نمرودیت
نذر آب اور خاکستر ہو کر رہ جائیگی۔ زمانے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بڑی زبردست سلطنتیں جو کانوا اشد منکم قوۃ وآثارا
فی الارض تھیں زور طاقت اور قوت میں مضبوط اور زمین میں اپنی روایات آثار اور علامات رکھتی تھیں۔ چشم
زدن میں خاکستر ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح کہ فما بکت علیہم السماء جن پر آسمان نے ایک آنسو بھی نہ گرایا۔

وما بکت علیہم الارض اور زمین میں ایک بھی ہمدردی کرنے والا نہ اٹھا۔ سچ ہے والعصر ان الانسان لفی خسر زمانہ شاہد ہے کہ انسان خسارہ میں ہے۔

نظام الٰہی

قبل اس کے کہ نظام الٰہی مکتوبات الٰہی۔ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی چیزوں سے متعلق کچھ بیان کیا جائے ایک شبہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ انسان مجبور محض ہے "پتھر" ہے۔ تقدیر کے شکنجہ میں ہے۔ کوئی کام کوئی حرکت بغیر حکم الٰہی نہیں کر سکتا۔ نیک ہو خواہ بد۔ بذات خود کوئی نیک اور کوئی بد نہیں ہے۔ سب اس کے اشارے پر چلتے ہیں گویا نیکی کا فاعل بھی وہی ہے اور بدی کا فاعل بھی؟ بلکہ تمام نیک و بد لکھا جا چکا ہے۔ اگر کوئی ظلم کرتا ہے تو اس کی تہ میں قدرت کا ہاتھ مخفی ہے۔ صاحب قدرت یعنی اللہ (معاذ اللہ) خود ظلم کر رہا ہے۔ کوئی بدکاری کرتا ہے۔ کوئی چوری کرتا ہے کوئی شراب پیتا ہے۔ غرض جو کچھ ہو رہا ہے سب استاد ازل کے اشارے سے ہو رہا ہے سب تقدیر کے کرشمے ہیں۔ کوئی تخت حکومت پر ہے تو تقدیر سے۔ کوئی تختہ دار پہ ہے تو تقدیر سے۔ کوئی سرمایہ دار ہے تو اسکی تقدیر۔ کوئی مزدور ہے تو اسکی تقدیر۔ کوئی نیک ہے تو اسکی تقدیر اچھی ہے۔ کوئی بد ہے تو اسکی تقدیر بری ہے۔ غرض یہ کہ انسان اپنے افعال کا مالک و مختار نہیں سمجھا جاتا۔ اگر یہ خیال صحیح ہے۔ "تقدیر" کے یہی معنی ہیں کہ انسان کوئی کام اپنے ارادہ سے نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا ارادہ تو سرے سے ہی نہیں۔ تو معاذ اللہ دنیا میں تمام فسادات کا ذمہ دار خود صاحب تقدیر ہے۔ انسان نہ نیک ہے ونہ بد۔ نہ جنتی ہے نہ جہنمی۔ بلکہ یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں جو شرمندۂ معنی نہیں ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ پھر سلسلۂ نبوت، کتاب اور الہام جو نیکی کو بدی، جنت کو جہنم اور انسان کو شیطان سے الگ کرنے کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور پھر انسان کی حدیں حیوان کیا بلکہ نباتات اور جمادات کی حدود اور قیود سے مل جائینگی۔ انسانیت تباہ ہو جائیگی۔ عقل، ادراک اور شعور بے معنی چیزیں ہو جائینگی۔

دراصل ناداروں اور محکوموں نے اپنے کو ناکامی کی ندامت اور ناداری اور محکومی کی ذلت سے بچانے کے لئے تقدیر کو ایک حیلہ اور بہانہ بنا رکھا ہے۔ حضرت اقبال مرحوم نے فرمایا ہے

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی

عمل سے فراغت کے لئے تقدیر کو بہانہ بنا کر یا خدا کو فریب دے رہا ہے یا اپنے آپ کو۔ اور حقیقت میں صرف

اپنے آپکو دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ وما یخدعون الا انفسہم۔

ایک اور مقام پر اقبالؒ مرحوم ابلیس کا پیغام یوں سناتے ہیں:-

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا　　　　میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

مسلمان جب منعمی سے ناداری میں، حکومت سے محکومیت میں، عزت سے ذلت میں اور عروج سے پستی میں آگیا اور پھر ایسا گرفتار ہوا کہ ناداری، محکومی، ذلت اور پستی اس کے گلے کا ہار ہوگئی۔ تو وہ ان تمام ذلتوں، پستیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کو تقدیر کے سر ڈال کر اطمینان کے سانس لینے لگ گیا۔ کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہ؟ گویا پہلے لوگوں، اسلاف صالحین کی کامرانیوں اور مراد مندیوں کو بھی اتفاقیہ اور تقدیری چیز سمجھتا ہے، ان کی جدوجہد، ایثار اور قربانیاں اس کی نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ الامان

ادھر دوسری اقوام پر نظر ڈالئے۔ ہر صبح ان کی شام سے جدا معلوم ہوتی ہے۔ کل ایک قوم غلام ہے۔ تو آج وہ آزاد ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا　　　　کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

ناظرین طلوع اسلام مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ "تقدیر انسانی" انسان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ انسان اپنے اعمال کا مختار خود ہے۔ ہاں شیریں اور تلخ کی اس کو خبر دی گئی ہے۔ نیکی اور بدی بھی اس کو لکھ کر بتادی گئی ہے۔ اب ہر وہ چیز جو انسان کے لئے مزوری ہے۔ انسانی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ ہاں "تقدیر الٰہی" یہ کہ انسان کسی دوسری نوع میں (جو خلاف انسان ہو) منتقل نہیں ہو سکتا، انسان غیر انسان نہیں بن سکتا۔ انسان انسان ہے۔ حیوان غیر عاقل حیوان ہے۔ جماد جماد ہے اور نبات نبات۔ ہاں انسان کو حیوان غیر عاقل کی طرح غیر عاقل قرار دینا یا جماد اور نبات کی طرح بے دست و پا بنانا۔ خدا کی دی ہوئی طاقتوں سے کام نہ لینا، خدا کی تسخیر کردہ قوا کو بیکار کر دینا۔ خود تقدیر الٰہی کو بدلنا ہے نہ کہ تقدیر الٰہی کا قائل ہونا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ تقدیر کو کوسنے کا موقعہ مل جائے اور اپنے آپ کو ہر قسم کی جدوجہد سے معاف اور مستثنیٰ رکھا جائے۔ اقبالؒ مرحوم مسلمانوں سے یوں شکوہ سنج ہیں:-

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟　　　　خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں!　　　　تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

مطلب یہ کہ اے مسلمان! تیرا دریا ساکن ہے، تیری زندگی میں طوفان نہیں آتا۔ تیری خودی نامسلمان ہے اس لئے اگر تو "تقدیر" کا شکوہ کرتا ہے تو عبث اور بے جا ہے۔ تجھے چاہئے کہ تو خود "تقدیر" کا یزداں بن جائے۔ پھر اقبال[7] مرحوم خدا تعالےٰ کے حضور یوں ملتجی ہوتے ہیں ؎

دِگرگوں عالم شام و سحر کر! جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر!
رہے تیری خدائی داغ سے پاک! میرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر!

جہاں کی شام و سحر کو بدل دے اور اس خشک و تر کے جہان کو نیچے اوپر یعنی تباہ و برباد کر دے تاکہ تیری خدائی ہمارے داغ ہائے غلامی سے پاک ہو جائے۔ اے اللہ میرے سجدوں سے جو بے ذوق ہیں تو پرہیز کر۔ اور ان کی بجائے باذوق سجدوں کی توفیق دے۔

نظامِ الٰہی کیا چیز ہے؟ اس سے متعلق چند عنوانات سے جو درج ذیل ہیں۔ جواب مل سکتا ہے۔

قتال "لکھ دیا گیا تم پر "قتال" اور وہ ناگوار ہے تمہارے لئے۔ ہو سکتا ہے کہ تم ناگوار سمجھو کسی چیز کو اور وہ بہتر ہو تمہارے لئے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم دوست رکھو کسی چیز کو اور وہ بری لگے تمہیں۔ اور اللہ تعالےٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"[۲۱۶ بقرہ]

کوئی کام بغیر جد و جہد انجام نہیں پا سکتا۔ "نظامِ الٰہی" کے لئے بھی جد و جہد کو کام میں لانا چاہئے جس کو بالفاظ قرآنی "قتال" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک چیز ظاہراً بری ہے مگر حقیقت میں اچھی ہے۔ ایسا ہی ایک چیز ظاہر میں اچھی ہے مگر ہے بری۔ یعنی اس وقت تمہاری ذہنی عیاشی، نظری عیاشی، عملی عیاشی اور لسانی عیاشی سے یہی توقع ہو سکتی ہے کہ فی سبیل اللہ قتال اور نظامِ الٰہی کے لئے جد و جہد کی تمہیں ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ جد و جہد تمہیں بہت بری لگتی ہے۔ مگر تمہارے نقطۂ نگاہ کے بدل جانے سے تمہاری تمام تر توجہ نظامِ الٰہی کی اشاعت میں "قتال" کی طرف مبذول ہو جائیگی۔

مگر "قتال" کیوں کیا جائے؟ اس کی غرض اور وجہ کیا ہے؟ اور سبیل اللہ سے کیا مراد ہے۔ اس کیلئے ذیل کے سطور پر نگاہ ڈالنا چاہئے۔

وجہ قتال "اور کیا ہو گیا تمہیں کہ تم قتال نہیں کرتے اللہ تعالےٰ کی راہ میں اور ضعیف مردوں، عورتوں اور بچوں کی راہ میں جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب! نکال دے ہمیں اس گاؤں سے جس کے باشندے ظالم ہیں اور (کہتے ہیں) بنا دے ہمارے لئے اپنے ہاں سے حمایتی اور دوست۔ اور بنا دے ہمارے لئے اپنے ہاں سے کوئی مددگار۔ جو لوگ مومن (امن قائم کرنیوالے) ہیں وہ قتال کرتے ہیں اللہ تعالےٰ کی راہ میں۔ اور جو کافر ہیں قتال کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں۔ پس قتال کرو تم (اے مومنو) شیطان کے اولیاء اور

حامیوں سے۔ بے شک شیطان کی تدبیر کمزور اور ضعیف ہے"۔ ع النساء

معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں قتال درحقیقت کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حمایت میں قتال ہے جو مظلوم ہیں اور ظالموں کے ہاتھوں تنگ آکر اپنے رب تعالےٰ سے فریاد کرتے ہیں کہ ان کو ظالموں کے دستِ تظلم سے نجات دلا دے۔ ظالم خدا کی راہ میں سرکشوں کو اپنا ولی سمجھتا ہے اور مومن سرکشوں کے شر و فساد کو رفع کرنے کی خاطر مظلوموں کی حمایت میں لڑتا ہے مگر بعض لوگ مظلوموں کی حمایت سے جی چراتے اور ظالموں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ وہ دراصل قتال سے جی چراتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یوں ارشاد فرمایا۔

قتال سے جی چرانا

"پس جونہی کہ ان پر لکھ دیا گیا 'قتال' (مظلوموں کی حمایت میں) اسی وقت ایک فریق انہیں ڈرتا ہے لوگوں سے مثل ڈر اللہ کے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور کہتے ہیں اے ہمارے رب! کیوں لکھ دیا تو نے ہم پر قتال"۔ ع النساء

ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قتال کا حکم سنتے ہی ظالموں سے ڈرتے ہیں اور مظلوموں کی حمایت کا نام بھی نہیں لیتے۔ یا وہ درحقیقت ظالموں سے بہ نسبت مظلوموں کے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں اور خدا تعالےٰ کے لکھے کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں کہ ہم پر قتال کیوں لکھ دیا گیا۔؟

ہدایت اختیاری چیز ہے

"ہم نے نازل کی تیرے اوپر الکتاب، لوگوں کے لئے ساتھ حق کے۔ پس جو ہدایت حاصل کرے تو اس کے اپنے نفس کے لئے (مفید) ہے اور جو گمراہ ہو پس حقیقت یہ ہے کہ وہ گمراہ ہوتا ہے اپنے نفس پر (یعنی اسکا نقصان اسکو پہونچتا ہے) اور تم (اے رسولؐ) لوگوں پر وکیل نہیں ہو"۔ ع الزمر

معلوم ہوا کہ خدا تعالےٰ کی 'الکتاب' لکھی ہوئی چیز پر عمل کرنا یا نہ کرنا، راہ حاصل کرنا یا راہ گم کر دینا، انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ خدا تعالےٰ کی طرف سے اس پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لوگوں کی من گھڑت تقدیر قرآن کریم کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔

رہبانیت (گوشہ گزینی) خدا تعالےٰ نے نہیں لکھی

"اور رہبانیت (گوشہ گزینی اور عزلت) کو لوگوں نے خود گھڑ لیا ہے ہم نے اس کو لوگوں پر نہیں لکھا"۔ ع الحدید

ثابت ہوا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے بندوں کو کوئی حکم نہیں ہے کہ وہ انسانی زندگی، بیوی اور بچوں کی زندگی، ہمسایہ اور قریبی کی زندگی، دوست اور رشتہ دار کی زندگی، حاکم اور رعیت کی زندگی سے بھاگ کر۔ ان کا مقابلہ کرنے حق کی حمایت کرنے اور باطل کو دبانے اور مٹانے کی بجائے اپنے متعلقین کو جہنم کی آگ میں اپنے ہاتھوں جھونک کر صرف اپنے آپ کو بچایا جائے۔ بلکہ اس کے خلاف نظام الٰہی یہ ہے کہ انسان جیسا کہ قتال کے ضمن میں واضح کیا گیا ہے۔ مظلوموں کی حمایت میں جو درحقیقت اللہ کی راہ ہے اپنے آپکو ظلم کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دے۔

ہندوؤں کا یوگ اور سنیاس۔ عیسائیوں کا زہد و ورع ترک دنیا۔ خدا تعالےٰ کی طرف سے لکھا ہوا اور پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی ان دونوں قوموں کی دیکھا دیکھی دنیا کو مردار کہہ کر اس پر لات مار کر بیوی اور بچوں کو تیاگ کر زاویوں اور گوشوں میں چھپ رہنے کو زندگی قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک طرح سے نفس کا دھوکہ ہے۔ جس میں اس کا اپنا آرام پوشیدہ ہے۔ عوام کو سخت دھوکہ لگتا ہے کہ وہ ایسے تارک الدنیا اور درحقیقت دنیا کی تکالیف اور مشقتوں سے بھاگے ہوئے انسانوں کو "اولیاء اللہ" قرار دیتے ہیں۔ اور خود بھی گویا ترک دنیا پر صاد کر کے دنیا سے بیزار ہیں۔

اقبال مرحوم نے اس ولایت اور خانقاہی فلسفہ کے خلاف قوم کو متنبہ اور بیدار کیا ہے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

حضرت اقبال ؒ شبیریت اور حسینیت کی تلقین کرتے ہیں کہ زندگی تو نظام ربوبیت بلند کرنے اور اس کی اشاعت میں جان تک سے درگزر نے کا نام ہے۔ خانقاہی فقر۔ رہبانیت اور گوشہ گزینی تو اندوہ و غم اور دلگیری کا نام ہے اور مرنیوالی امتوں کا عالم پیری ہے جس کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ موت ہی موت ہے اور حقیقت اس کے علاوہ یہ ہے وہ یہ کہ "ملوکیت کے شیاطین" نے اپنی آنکھوں کے جادو اور نظر کی بجلی سے شکار کے دل میں شکار ہو جانیکا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ گویا رہبانیت اور گوشہ گزینی خود کو ملوکیت کا صید بنا دینے کے مرادف ہے۔

معیار ولایت

اللہ میاں کے ہاں معیار ولایت، قرآنی تصریحات کے مطابق حسب ذیل ہے۔

"کہہ دو اے ہدایت کے دعویدارو! اگر تمہارا زعم ہے کہ تم ولی ہو اللہ کے نہ کہ دوسرے

لوگ ۔ پس تمنا کرو موت کی اگر ہو تم سچے ۔ اور وہ اس کی تمنا کبھی نہ کرینگے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے" ۲۸/۱ ع الجمعۃ

ولایت کا معیار یہ ہے کہ "موت" کی تمنّا کی جائے یعنی موت سے بھاگنے اور جان بچانے کی بجائے خود "موت" کے منہ میں جانیکی کوشش کرنا ہی ولایت ہے ۔ اور جو لوگ موت سے بھاگتے ہیں وہ "ولی" نہیں ہیں ۔ اس حقیقت کو ترجمان حقیقت حضرت اقبالؒ یوں فاش کرتے ہیں ؎

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد   کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد

بتوں کو میری لا دینی مبارک   کہ ہے آج آتشِ اللہ ہو سرد

غلبہ الوہیت

اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ میں ضرور غالب ہونگا اور میرے رسولؑ ۔ بے شک اللہ تعالیٰ طاقتور اور عزت والا ہے ۲۸/۳ ع المجادلۃ

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا غلبہ لکھ دیا گیا ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا ۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؑ ہمیشہ غالب ہونگے ۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوںؑ کا غلبہ ان کے بتائے اور تیار کئے ہوئے نظام کا غلبہ ہے ۔ اور جو شخص بھی اس نظام کی حمایت اور اشاعت کریگا لازماً وہ بھی غالب رہیگا ۔ "مسلمان" خدا تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے بتائے اور مقرر کئے ہوئے "نظام" کو دنیا میں پھیلانے والوں سے پہلا ہے ۔ مگر جہاں "مسلمان" "مغلوب نظر آئیگا" وہاں خدا تعالیٰ کے اس "غلبہ" کو سامنے رکھ کر اُسے نام کا مسلماں یا نامسلماں قرار دینگے ۔ ورنہ لازم آئیگا کہ خدا کا لکھا بھی ٹل سکتا ہے یا معاذ اللہ خدا تعالیٰ اور اسکے رسولؑ بھی مغلوب ہوسکتے ہیں ۔ اور یہ باطل ہے ۔

رحمت اور اس کی وسعت

(الف) حضرت موسےٰؑ کی قوم میں سے ستر منتخب آدمیوں نے کہا" اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں خوبی اور آخرت میں بلاشبہ ہم نے راہ پائی ہے تیری طرف فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) میرا عذاب پہونچاتا ہوں میں اُسے جس کو مناسب سمجھتا ہوں (عذاب کے) اور میری رحمت ہر چیز کو وسیع ہے ۔ پس میں لکھونگا وہ رحمت ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں اور زکواۃ ادا کرتے ہیں ۔ اور جو ہماری آیات کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں ۔ ۹/۱۹ ع الاعراف

مومن اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں خوبی اور حسنہ لکھوانیکی درخواست کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے

بچا ہوا اُسے ملتا ہے۔ گویا مومن کی دنیاوی اور اخروی زندگی دائماً حسین رہیگی اور تمام قبائح اور انکے نتائج سے بالاتر اور محفوظ ہوگی کیونکہ مسلمان کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت اور راہ مل گئی ہے۔ وہ راہ کیا ہے اللہ تعالےٰ کا نظام ہے جس پہ مسلمان کا قدم ہے چونکہ نظام الٰہی خوبصورت ہے اس پر عمل کرنا بھی حسن ہے۔ پھر فرمایا کہ اختیارات الٰہیہ میں سے ہے عذاب اور رحمت۔ عذاب تو انکو پہونچتا ہے جو عذاب کے مستحق ہوتے ہیں اور رحمت تمام چیزوں کو اپنی وسعت میں لے لیتی ہے۔ مگر رحمت اس کے حساب میں لکھی جاتی ہے اور اسکو معاوضہ دی جاتی ہے جو متقی ہو۔ یعنی غیر اللہ کو اپنا والی اور محافظ نہ سمجھتا ہو اور زکواۃ (یعنی قومی تعمیر میں مال اور دولت کا حصہ) کو اچھی طرح ادا کرتا ہو اور خدا تعالےٰ کی آیات قدرت اور نشانیاں اس کے ایمان میں داخل ہوں۔

(ب) "اور جب آئیں تیرے پاس وہ جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات کیساتھ تو کہہ سلامتی ہو تم پر۔ لکھ دی ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت۔ بلا شبہ جس نے عمل کیا تم میں سے "عمل سوء" نادانی سے پھر توبہ کی اس نے اس کے بعد اور اصلاح کی تو وہ (رب تعالےٰ) مغفرت کرنیوالا پیار کرنیوالا ہے" $\frac{۷}{۱۲}$ ع الانعام

اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) مومن جب اللہ تعالےٰ کے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو رسولؐ ان پر سلامتی کی دعا (سلام علیکم) کی پہل کرتے ہیں۔ امام یا لیڈر کو چاہیے کہ جب ان کے مقتدی اور متبع ان کی خدمت میں حاضر ہوں تو وہ پہل کریں۔ غیر خدائی نظم ونسق اسکے خلاف ہے۔ ماتحت افسر کو متبع آقا کو سلام کرتا ہے۔

(۲) جو عمل سوء نادانی سے عمل میں آیا ہو پھر اس سے توبہ کرکے اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جائے تو ایسے لوگ خدا تعالےٰ سے مغفرت اور پیار کے مستحق ہوتے ہیں۔

ربوبیت الٰہی اور اسی پہ استقامت

مومن خدا تعالےٰ کو رب (جسمانی اور روحانی نظام کا مالک) سمجھ کر اس پر استقامت رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

"بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر مستقیم اور پختہ ہوگئے نازل ہوتے ہیں ان پر فرشتے کہ مت خوف کرو اور مت غمگین ہو۔ اور خوش خبری ہو تمہیں "الجنّۃ" کی جسکا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (فرمایا) ہم تمہارے ولی ہیں زندگی دنیا اور آخرت میں۔ تمہارے لئے ہے وہ جسکو تم طلب کروگے جو غفور۔ رحیم کی طرف سے تمہارے لئے مہمانی ہوگی۔ $\frac{۴}{۱۸}$ ع

قرآن کریم تمام دنیا کو یہی دعوت دیتا ہے کہ ارباب من دون اللہ سے منہ موڑ کر صرف ایک خدا کو اپنا رب بنائیں۔

اس میں تمام دنیا کی وحدت کا راز مضمر ہے۔ ارباب کی تفریق سے دلوں میں تفریق قائم ہو کر وحدت نہیں رہ سکتی۔ اور وحدت ربی سے دنیا کے خواہشات اور جذبات کا رُخ ایک طرف ہو کر دنیا میں صحیح اتحاد قائم ہو سکتا ہے یہی نظام الہٰی کا بنیادی مسئلہ ہے جسے توحید کہتے ہیں۔

اور جو اس توحید اور ربوبیت الہٰی پر مستقیم اور مستقل رہتے ہیں وہ بے خوف اور بے حزن زندگی بسر کرتے ہیں اور انہیں "الجنۃ" کی بشارت دی جاتی ہے۔

اس "توحید" کو قائم رکھنے کے لئے شرک کی پُر زور تردید کی گئی ہے۔ کہیں شرک کو "ظلم عظیم" قرار دیا گیا ہے کہیں اسے ہمیشہ کے لئے "عدم مغفرت الہٰی" کا باعث قرار دیا گیا کہیں شرک کو تفرقہ کا سبب سمجھا گیا ہے۔ شرک ہی سے قوموں میں تنفر۔ ان کے اعمال میں تشتت اور پراگندگی آجاتی ہے۔

دین فطرت اللہ ہے

"ہر طرف سے منہ پھیر کر دین کے لئے اپنا رخ سیدھا کر لو (دین) خدا کی فطرت ہے۔ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلق کے لئے کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ (اس لئے دین میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ یہی دین لوگوں کے قیام اور قوام کا ضامن ہے۔ پر اکثر لوگ نہیں جانتے (تمہیں چاہیئے کہ اسکی طرف اپنا رخ کر لو) اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اسی کی حفاظت میں آجاؤ۔ اور قائم کرو "الصلوٰۃ" اور مت ہو مشرکوں سے (یعنی) ان لوگوں سے جنہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اپنے دین کو اور ہو گئے گروہ گروہ (اس حالت میں کہ) ہر گروہ جو کچھ اسکے پاس ہے اس میں خوش اور مست ہے۔ (ع الروم)

ان آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح خلق اللہ میں تبدیلی نہیں ہوتی فطرت اللہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور فطرت اللہ دین قیم ہے۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اس دین کی طرف توجہ کر لی جائے۔ وہی فطرت دین ہے وہی نظام الہٰی ہے۔ جب ایک ہی دین ہے ایک ہی فطرت ہے تو تمام لوگوں کو چاہیئے کہ فرقہ بندیاں توڑ کر ایک ہی دین اور ایک ہی نظام سے منسلک ہو جائیں۔ وہ کیا ہے؟ یہ کہ۔

اُسی اللہ کی طرف توجہ کریں۔ اسی کی حفاظت میں آجائیں۔ "الصلوٰۃ" کو قائم کریں اور مشرک نہ بنیں کیونکہ شرک ہی تمام فرقہ بندیوں کی جڑ ہے۔

عبادت الہٰی

"فطرت اللہ" یہی سبق دیتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ہی غلامی کی جائے۔ فرمایا:۔

"اور ان کو نہیں امر کیا گیا مگر اس کا کہ وہ غلامی کریں اللہ تعالےٰ کی خالص کرنے والے ہوں اس کیلئے دین کو۔ دوسری تمام اطراف سے منہ موڑنے والے ہوں۔اور قائم کریں نماز کو اور ادا کریں زکواۃ کو۔اور یہی مضبوط دین ہے۔"

ہر چہار طرف سے منہ پھیر کر صرف خدا تعالےٰ کی غلامی، نماز کا قیام اور زکواۃ کی ادائیگی ہی مضبوط دین ہے۔

غیر اللہ کی غلامی جائز نہیں ہے

"نہیں موزوں کسی بشر کے لئے جسے اللہ تعالیٰ دے "الکتاب" اور "الحکم" اور "النبوت" پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم ہو جاؤ میرے غلام اللہ کے سوا۔لیکن وہ یہی کہے گا کہ ہو جاؤ تم رب والے۔بوجہ اس کے کہ تم سکھاتے ہو "الکتاب" اور بوجہ اس کے کہ تم پڑھتے ہو اس کو۔" ع آل عمران

انبیاء علیہم السلام۔جو نظام الہٰی کو دنیا تک پہونچانے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں یہ کہلوایا گیا کہ وہ لوگوں کو ہر ایک کی غلامی اور اپنی غلامی کا طوق اتارنے اور صرف خدا تعالےٰ کی غلامی قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مساوات قومی

دین الہٰی یا نظام الہٰی میں کوئی بڑا نہیں اور کوئی چھوٹا نہیں۔نہ قوم کا فرق ہے نہ ملک کا سب خدا تعالےٰ کے ہاں برابر ہیں فرمایا۔"اے دنیا بھر کے لوگو! ہم نے پیدا کیا تم کو ایک نوع کے جوڑے مرد اور عورت سے۔اور بنایا ہم نے تم کو شاخ در شاخ (نسب کے لحاظ سے) اور قبیلے در قبیلے۔تاکہ تم ایک دوسرے کی جان پہچان کر سکو (سن لو) بے شک تم میں زیادہ عزت والا اور مکرم تم میں سے زیادہ متقی ہے۔" ع الحجرات

اس جگہ اس حقیقت کو طشت از بام کیا گیا ہے کہ نسبی اور نسلی تفاخر خدا کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔سید۔بلوچ۔پٹھان۔امیر،غریب کی تمیز میں ایک کا دوسرے کے مقابلے میں ادنےٰ اور اعلیٰ بن جانا خدا تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔کیونکہ سب انسان ایک ہی نوع کے مرد اور عورت سے پیدا کئے گئے ہیں۔اور قبائلی امتیازات محض تعارف اور جان پہچان کا درجہ رکھتے ہیں۔ہاں ایک اور حقیقت ہمیشہ یاد رکھنے والی ہے وہ یہ کہ خدا تعالےٰ کے ہاں مکرم اور معظم بننے کا معیار یہ ہے کہ جو انسانوں میں سے اتقیٰ زیادہ سے زیادہ خدا سے لو لگانے اور اسکی حفاظت میں زندگی بسر کرنے والا) ہو گا وہی قابل عزت ہو گا۔اس لئے خدا تعالےٰ کے آخری رسول فداہ ابی وامی نے فرمایا۔"لا فضل لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر ولا لعربی علی عجمی۔ولا لعجمی علی عربی۔الا کلکم بنو ادم وادم من تراب جس کا ترجمہ

علامہ اقبالؒ مرحوم کی زبانی سنیئے

مذہب او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکرِ فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

الغرض "نظامِ الٰہی" اپنے دامن میں ہزاروں وسعتیں رکھتا ہے۔ طوالت کے خوف سے مندرجہ بالا کڑیوں پر اکتفا کیا گیا۔

روحِ مضمون

"تمام مضمون کی روح الفاظ ذیل میں پوشیدہ ہے"

(۱) اللہ ہی تمام دنیا کا خالق ہے۔ زمین و آسمان وما بینہما کا خالق ہے۔ اس کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ لا الٰہ الا ھو۔ (لا خالق الا ھو)

(۲) اس نے ہر چیز کو اندازے سے بنایا۔ انسان کو انسان بنایا۔ حیوان کو حیوان۔ جماد کو جماد۔ نبات کو نبات کوئی ایک چیز دوسری نوعیت میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی تقدیر ہے۔ لا الٰہ الا ھو۔ (لا مقدر الا ھو)

(۳) انسان اپنے افعال میں خود مختار ہے۔ نیکی بدی اس کے اپنے قبضے میں ہے۔ اس خالق اور مقدر خدا نے بندوں کی رہبری کے لئے اپنا نظام بھی مختلف رسولوں کے ذریعہ بھیجا۔ اس کی تکمیل سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کر دی۔ اسی کو نظامِ الٰہی "الکتاب" فطرت اللہ دین کہتے ہیں۔ مومنوں کو چاہیئے کہ خدا تعالےٰ کی لکھی ہوئی اور بھیجی ہوئی تعلیم کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق زندگی کو ڈھال لیں۔ جس کا فائدہ عمل کرنے والے کو ہی پہونچتا ہے۔

اسی نظام کے ماتحت مندرجہ ذیل عنوانات سے تعارف کرایا گیا ہے۔

قتال۔ قتال سے جی چرانا۔ ہدایت اختیاری چیز ہے۔ رہبانیت اور گوشہ گزینی۔ اللہ کا غلبہ۔ وسعت رحمت ربوبیت الٰہی۔ دین الفطرت۔ عبادت الٰہی۔ غیر اللہ کی غلامی کی نفی اور مساوات قومی

واللہ ھو الہادی الی الصراط المستقیم۔ والصلوٰۃ والسلام الاتم علی رسولہ الکریم وآلہ [illegible]

مشتاق احمد خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مطالب معارف القرآن

(جلد اوّل)

مضمون	صفحہ
مطلع ۔ حسنِ مطلع ۔ حرفِ نو ۔ حرفِ مدعا	ا-۴
فہرست	۵
مقدمہ :- علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ	۲۰
تعارف :- پرویز	۴۴-۵۷
اللہ ص ۳ تا ص ۲۷	
ایک بالاتر ہستی کا احساس فطرتِ انسانی کے اندر وجدانی طور پر موجود ہے	۳
اس ہستی کو الٰہ کہا گیا ہے (وہ جس کے سامنے جھکا جائے)	۳
خارجی اثرات فطرتِ صالحہ کے اس احساس میں رنگ آمیزی کر دیتے ہیں	۳
غیر خدا معبودان کا تصور اسی رنگ آمیزی کا نتیجہ ہے ۔	۴
خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل اور اصلی حقیقت سے بیگانگی کا نتیجہ ہے ۔	۴
وحیِ الٰہی اس رنگ آمیزی کو الگ کر کے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کرنے کے لئے آتی ہے ۔	۴
یہ تعلیم ازل سے ابد تک حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتی رہی ہے	۴
یہی تعلیم اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اور اس کے باہر کہیں نہیں ۔	۶
[illegible] اسلام [illegible] دینِ خداوندی ہے ۔	۸

مضمون	صفحہ
اللہ کا صحیح تصور صرف قرآن کریم میں مل سکتا ہے ۔	۹
اللہ حقیقی کی صفات	۹
قدامتِ مادہ کے عقیدہ کا ابطال	۱۰
ابنیت اور اوتار کے عقائد کی تردید	۱۰
اللہ حقیقی کسی خاص قبیلہ یا جماعت کا خدا نہیں، رب العالمین ہے ۔	۱۲
نظامِ کائنات پر قادر و مختار وہی ہے ۔	۱۲
کائنات پر حکومت بھی اسی کی ہے ۔	۱۳
استبداد کی بنا اس غلط تصور پر ہوتی ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کو رزق کا مالک سمجھ لیتا ہے ۔	۱۳
رزق کے سرچشموں کا مالک خدائے واحد ہے اس لئے انسانوں کی غلامی کیوں اختیار کی جائے ؟	۱۳
موت و حیات بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔	۱۴
چونکہ اللہ حقیقی تمام نوعِ انسانی کا واحد خدا ہے اس لئے عالمگیر اخوت اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے ۔	۱۴
وحدتِ الٰہ ۔ وحدتِ نفس اور وحدتِ کائنات یہ اسلام کے اصول و مبادیات ہیں ۔	۱۵
[illegible] عقیدہ [illegible] اسی صحیح عقیدہ پر مبنی ہے جو قرآن [illegible] ہے ۔	۱۵
اللہ حقیقی کا صحیح تصور قرآن کریم میں اس لئے موجود ہے کہ قرآن اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے ۔	۱۵

مضمون	صفحہ
قرآن علم و بصیرت کے ساتھ نازل ہوا ہے اس لئے تو ہم پوتی کو اس میں کوئی شائبہ نہیں۔	۱۵
علم و بصیرت عقیدۂ توحید کے متقضی ہیں۔ کیونکہ ایک سے زیادہ آقاؤں کے ماتحت کوئی نظام چل نہیں سکتا۔	۱۶
الگ الگ خداؤں کا تصور ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے جب اسے نظام کائنات میں کوئی ربط و ضبط نظر نہیں آتا تھا۔	۱۷
ذہن انسانی نے اپنے رشد و بلوغت کو پہنچکر مشاہدہ کرلیا کہ کائنات کی مشینری کا ایک ایک پرزہ باہم پیوست ہے۔	۱۷
نظام انسانی میں فتنہ و فساد بھی اس لئے ہے کہ خدائے واحد کی جگہ الگ الگ معبودوں کی پرستش ہو رہی ہے	۱۸
وحدت کائنات کا علم چونکہ انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اس لئے نادان لوگ وحدت الٰہ کے دعوے کو استعجاب و تحقیر سے ٹھکرا دیتے تھے۔	۱۹
لیکن قرآن کریم نے علانیہ کہدیا کہ یہ ان کی جہالت ہے علم کی روشنی آجانے پر ان سب کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا	۱۹
علم آجانے کے بعد معلوم ہوگا کہ شرک خود اپنی خودی سے بیگانگی اور عظمت سے بے خبری کا نام تھا۔	۲۰
لیکن مستبد قوتیں کبھی خودی کی اس بیداری کو گوارا نہیں کرتیں اور ایسے خود آگاہ و خدا مست مردانِ حریت کے خلاف ہر قسم کی سختی روا رکھتی ہیں۔	۲۱
اصحاب کہف اور حضرت موسیٰ کی مثالیں۔	۲۱
بنی اسرائیل کا شرک کی طرف میلان انہی وجوہات کے باعث تھا	۲۲
شرک کی مختلف شکلیں۔ مجوسیوں اور عیسائیوں کا شرک	۲۳
اہل ہنود اور اہل یونان کا شرک	۲۴
احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی پرستش	۲۴
شرک کی ایک خوفناک لیکن غیر محسوس شکل۔ یعنی انسان کا اپنی خواہشات کو خدا بنا لینا۔	۲۵
وحدت جو ذہن انسانی کے کارخانہ میں ڈھلتے اور تعصب انسانی میں رہتے ہیں۔	۲۵
دنیا میں سب سے بڑے فساد کے موجب یہی بت ہیں۔	۲۵
انہی بتوں کی پرستش سے علم ہمیشہ ذاتی جذبات کے تابع چلتا ہے	۲۶

مضمون	صفحہ
جس کی وجہ سے دنیا جہنم بنی رہتی ہے۔	
دنیا کے امن کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ ان تمام بتوں کو توڑ کر ایک خدائے حقیقی کے سامنے جھکا جائے۔	۲۶
خلاصۂ مبحث یعنی موضوع بالا پر ایک اجمالی نظر	۲۸

۲- اللہ ص ۲۸ تا ص ۴۹

مضمون	صفحہ
الٰہ حقیقی کا نام اللہ ہے	۲۸
اللہ کی ذات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔	۲۸
اس لئے اللہ کی ذات کے عرفان کا تقاضا غیر ایمانی ہے۔	۲۸
اس کی مثل بھی کوئی شے نہیں جس سے اس کی ذات کی ماہیت سمجھ میں آسکے۔	۲۸
اس کی مثال نور کی سی ہے۔	۲۸
کسی ہستی کی ہستی کا انکار نہیں پڑتا۔	۲۹
لیکن خدا کے متعلق صحیح تصور قائم کرنے میں ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے۔	۳۰
یہ غلطی اس طرح ہوتی ہے کہ انسان خدا کا تصور اپنے ذہن کے مطابق قائم کرتا ہے۔	۳۰
صفات خداوندی کا صحیح تصور صرف وحی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور وحی اپنی آخری شکل میں آج صرف قرآن کریم میں ہے۔	۳۰
دوسری کتابیں جن میں ذہن انسانی کی آمیزش ہو چکی ہے خدا کا غلط تصور پیش کرتی ہیں۔	۳۰
مثلاً ویدوں کی رو سے خدا کا تصور کیا ہے۔	۳۰
اوتار کا عقیدہ بھی اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔	۳۱
مسیحیت کے عقائد الوہیت	۳۱
ان عقائد کے مآخذ	۳۲
صفاتِ الٰہی کی اجمالی تفسیر	۳۲
توحید	۳۲
مجوسیوں کے عقیدۂ ثنویت کا بطلان	۳۲
عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی تردید	۳۳
دیوی دیوتاؤں کے عقیدہ کی مخالفت	۳۳
رسولوں کی پرستش	۳۴
بانیان مذاہب کے بُت۔ بدھ مت، جین مت، اہل چین	۳۴
اہل جاپان کے مذاہب میں انسان پرستی۔	

مضمون	صفحہ
رسول پرستی کا ابطال	۳۴
احبار و رہبان یعنی علماء و مشائخ کی پرستش	۳۵
اہل کتاب ایک خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود کیوں مشرک قرار دیے گئے کہ وہ کس قسم کے شرک کرتے تھے۔	۳۵
شرک کے ان تمام دروازوں کو بند کر کے ایک خدائے واحد و قہار کی عبودیت کی تعلیم	۳۶
محسوسات کے شرک کے بعد غیر محسوس انداز شرک	۳۶
مادہ پرستی کے اسباب وعلل	۳۷
ہر باب میں کس طرح عہد جاہلیت اور عہد حاضر کا انسان ایک ہی سطح پر ہے۔	۳۷
عقل انسانی کے حدود	۳۷
انسان تو ابھی اپنے جسم کی مشینری کی حقیقت سے بھی واقف نہیں	۳۸
ماہرین علم طبیعی اور علم النفس کی تحقیقات	۳۸
ڈاکٹر فرائڈ کے اسکول کا نظریہ "تجزیہ نفس"	۳۸
قرآن کریم مادی اسباب وعلل سے گزر کر ہی اس ذات مسبب الاسباب تک پہنچنے کی تلقین کرتا ہے۔	۳۸
سورۂ اخلاص ۔ بنیاد رسالت خدا پرستی	۳۸
ہو اللہ احد ۔ ایک آقا کے سوا کوئی اور آقا نہیں	۳۹
کسی انسان میں کوئی قوت بالذات موجود نہیں	۳۹
توحید قرآنی سے بجز اللہ کا خوف اٹھ جاتا ہے اور خودی کا استحکام خوف دور ہو جانے میں ہے	۳۹
یورپ کا شرک ۔ مظاہر فطرت کی تسخیر کر کے بھی انسانوں کے جلال اور دبدبہ سے مسخر	۳۹
صمدیت	
"اللہ بے نیاز ہے" کا صحیح مفہوم	۴۰
روح اور مادہ کی قدامت کا بطلان	۴۰
مادی کائنات کا نقطۂ آغاز	۴۰
لم یلد ولم یولد	
ابنیت اور ولدیت کا عقیدہ ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔	۴۱
ولادت کے عقیدہ کا لازمی جزو خدا کی بیوی کا عقیدہ ہے۔	۴۱
ابنیت کا عقیدہ اس لئے بھی قائم ہوا کہ انسان کے ذہن میں تخلیق کی کوئی اور صورت آ ہی نہ سکتی تھی۔	۴۱
آریہ مذہب والے تخلیق کا مسئلہ کس طرح نہ سمجھ سکے	۴۱
ان باطل نظریات کی تردید۔	۴۲
آج تمام مذاہب میں یہ تصور حقیقتاً موجود ہے مگر صاحب عقل بھی آہستہ آہستہ ان سے بیزاری کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔	۴۴
لارڈ ہیڈ سپ اور مسٹر مرے کی کتابیں اور ... کی تحقیقات	۴۴
قدیم بابلی، یونانی، اطالوی، مصری، مذاہب میں خدا کی بیویوں کے تصورات	۴۴
خدا کی بیٹیوں کا عقیدہ	۴۵
اس عقیدہ کی تردید	۴۶
خدا کے محترم بندوں کے متعلق بیٹا ہونے کا عقیدہ اور اس کا بطلان	۴۸
نبی اکرم بھی خدا کے عبد ہیں۔	۴۹
ولم یکن لہ کفوا احد	
اللہ کے مثل اور برابر کوئی نہیں۔	۴۹
خلاصہ بحث۔	۴۹
ضروری نکتہ ۔ خدا کی صفات پر ایمان کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ یہ ایک حقیقت ثابتہ کا اعتراف ہے۔ اور اس لئے کہ جو جماعت حکومت الٰہیہ کے قیام کی ذمہ دار ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ صفات خداوندی کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے۔	۴۹
صفات خداوندی پر ایمان ۔ اعمال انسانی کے ہر گوشے سے ہویدا ہونا چاہیے۔	۵۰
عقیدہ توحید کا عملی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ توحید پرستوں کی جماعت بھی ایک ہو۔ اس میں تفرقہ انگیزی نہ ہو۔	۵۱
عقیدۂ صمدیت کا اثر ۔ ملت اسلامیہ کو کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔	۵۲
عقیدہ لم یلد کا عملی اثر ۔ رنگ ونسل کے امتیازات کا ابطال	۵۳
ولم یکن لہ کفوا احد کا عملی نتیجہ ۔ جماعت مومنین کو یگانۂ روزگار ہونا چاہیے۔	۵۳
۳۔ خالقیت ص۵۵ تا ص۸۲	
اللہ تمام اشیا کو عدم سے وجود میں لایا ہے (مبداء)	۵۵
مبداء سے معاد پر استدلال	۵۵
تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔	۵۶

مضمون	صفحہ
خدا کے لئے نہ پہلی بار کی تخلیق کچھ مشکل ہے نہ دوسری بار کی۔	۵۷
کُن فیکون۔ تخلیق اشیاء کا ارادہ اور نتیجہ۔	۵۷
"کُن فیکون" سے یہ مفہوم کیا ہے۔	۵۹
مدارجِ تخلیق۔	۶۰
ارض و سماوات۔ نظام الافلاک کی تخلیق۔	۶۱
تخلیق کائنات۔ بے غرض و غایت۔ بلا مقصد نہیں ہوئی۔	۶۲
دورِ حاضرہ کے مادہ پرستوں کی بنیادی غلطی۔	۶۲
علم الاشیاء اور اسلام۔	۶۲
مسلمانوں کا فریضہ علوم طبیعی کے متعلق۔	۶۲
اللہ کے ذکر کے مفہوم کا ایک گوشہ۔ تفکر فی الخلق۔	۶۳
حکمائے مغرب اور حکمائے اسلام کا نقطۂ امتیاز۔	۶۳
سائنس اور مسلمان۔	۶۴
سینا و فارابی اور ہیوم و ڈارون میں فرق۔	۶۴
کائنات کی تخلیق بالحق ہوتی ہے۔	۶۵
اس سلسلہ کا بالحق ہونا خالق کائنات کی حکمت بالغہ کی دلیل ہے۔	۶۶
نظم کائنات اور مکافاتِ عمل میں باہمی تعلق۔	۶۶
نظام کائنات ایک مدت معینہ کے لئے چل رہا ہے۔ اس کے بعد نشأۃ ثانیہ (ایک دوسری زندگی) ہوگی۔	۶۷
اُس وقت یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ چھپے ہوئے نتائج سامنے آجائیں گے۔	۶۷
لہٰذا تخلیق کائنات بطور کھیل تماشا نہیں کی گئی۔	۶۸
ہندوؤں کے ہاں ایسا عقیدہ موجود ہے۔ اس کی تردید۔	۶۸
چونکہ تخلیق کائنات بالحق ہوئی ہے اس لئے اس میں تدبر ضروری ہے۔	۶۸
مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں۔	۶۹
کائنات میں کہیں کسی جگہ کوئی نقص نہیں، سقم نہیں۔	۷۰
مخلوق میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ نظریۂ تعطل کا ابطال۔	۷۰
مخلوق میں تزئین و آرائش کمی بیشی۔ سلب و نہب اور ثبات و قیام سب اللہ کے قوانین کے ماتحت ہوتا رہتا ہے۔	۷۲
کائنات میں ربط و ضبط بھی اللہ کے حکم سے قائم ہے۔	۷۳
وہ ہر شے کا خالق ہے کسی کا "باپ" نہیں ہو سکتا۔	۷۳
سلبی پہلو یعنی اس کے سوا کوئی اور خالق نہیں۔	۷۴

مضمون	صفحہ
معبودانِ باطل خود مخلوق ہیں۔ خالق نہیں ہیں۔	۷۵
دورِ حاضر کے "معبود" یعنی سائنس سے بھی کسی چیز کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ صرف نقاب کشائی ہوتی ہے۔	۷۶
خلاصۂ مبحث۔	۷۷
۴۔ امر۔ ص ۷۹ تا ص ۹۲	
عالم امر کیا ہے؟	۷۹
مادیت کی حدود سے باہر، سرحد ادراک سے بلند۔ نظام کائنات کا نظم و نسق عالم امر سے متعلق ہے۔	۷۹
انسانی علم مادی علت و معلول کے سلسلہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا	۸۰
اس سے آگے عالم امر ہے۔	۸۰
مظاہر فطرت اسی کے امر سے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہیں۔	۸۱
نظام کائنات کی ہر اسکیم ابتدا سے انتہا تک اسی کے امر کے مطابق مراحل طے کرتی ہے۔	۸۳
ہر امر پختگی حاصل کر کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔	۸۳
ہر امر کی تکمیل کے لئے خدائی اندازے مقرر ہوتے ہیں۔	۸۴
حضرت یوسفؑ۔ نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ عیسیٰؑ کے مختلف واقعات کے ساتھ فرمایا کہ یہ امور مقدر ہو چکے تھے۔	۸۴
جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح امر الٰہی کے ماتحت ہوئی تھی۔	۸۴
اعمال کی سزا بھی امر الٰہی کے مطابق مرتب ہوتی ہے۔	۸۵
اقوام سابقہ کے واقعات عذاب۔	۸۵
عہد رسالت مآبؐ کے منافقین و مکذبین۔	۸۶
امر الٰہی (مکافاتِ عمل) مختلف مدارج طے کر کے اپنے وقت میں بر آتا ہے۔	۸۶
جہاد کے میدانوں میں امر الٰہی کے مظاہرے۔	۸۷
کوئی قوت امر الٰہی کو ٹال نہیں سکتی۔	۸۷
اس لئے کہ اعمال کی جزا و سزا کے قوانین مشیتِ خداوندی سے متعلق ہیں۔	۸۸
موت بھی امر الٰہی ہے۔	۸۸
قیامت جو کائنات کی موجودہ اسکیم کا آخری باب ہے۔ امر	۹

مضمون	صفحہ
الٰہی ہے۔ اس کے بعد دوسری اسکیم شروع ہوگی۔	
ملائکہ امرِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔	۹۰
وحی بھی امرِ الٰہی ہے	۹۰
الروح بھی امرِ الٰہی ہے	۹۱
بعض مقامات پر امر کے معنی مجرد حکم کے بھی ہیں۔	۹۱
امر اور اذن کے معنی	۹۱
خلاصۂ بحث	۹۲

۵۔ ربوبیت ص ۹۳ تا ص ۱۰۲

مضمون	صفحہ
تخلیق کے بعد ربوبیت کا مرحلہ آتا ہے۔	۹۳
ربوبیت کے معنی	۹۳
بچہ کی پرورش میں ربوبیت کے کرشمے	۹۳
انسانی زندگی کی ضروریات اس کی شانِ ربوبیت سے بلا معاوضہ ملتی ہیں۔	۹۴
یہ انتظام کسی "اندھی فطرت" کا نہیں ہو سکتا۔	۹۴
دنیاوی مصائب ہمارے اپنے نظام کی خرابی سے ہیں۔	۹۴
غیر فطری نظامِ معیشت کی خرابیاں	۹۵
رب العالمین کی ربوبیت عامہ	۹۵
ہر شے کا رب وہی ہے۔	۹۶
رب مجازاً مالک اور آقا کے معنی میں۔	۹۶
حقیقی آقا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔	۹۶
رب العرش العظیم	۹۶
نظامِ فطرت کا پروردگار	۹۷
مرکزِ اسلام (مکہ) کا رب	۹۷
ربوبیتِ خداوندی کا احساس فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔	۹۷
انسان کا انکار ان پردوں کی وجہ سے ہے جو خارجی اثرات کی وجہ سے اس کی فطرتِ صحیحہ پر پڑ چکے ہیں۔	۹۷
قرآن کریم انہی غیر فطری پردوں کو اٹھاتا ہے۔	۹۷
ربوبیت میں خدا کا کوئی شریک نہیں۔	۹۷
مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے کر کمزور انسانوں سے اپنا دعوائے "خدائی" منواتی ہیں۔	۹۸
فرعونِ موسیٰ نے ایسا ہی دعویٰ کیا تھا۔	۹۸
ہر زمانے کا فرعون یہی کرتا ہے۔	۹۸
قرآن کریم ان تمام خود ساختہ "معبودوں" کی تردید سے ایک حقیقی رب پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔	۹۹
یہی ایمان ہے جس سے قلبِ انسانی حقیقی تسکین و طمانیت کا گہوارہ بن جاتا ہے۔	۹۹
یہی سچی آزادی اور حقیقی شرفِ انسانیت ہے۔	۱۰۰
لیکن انسان اپنے لیے خود غلامی کے طوق خریدتا رہتا ہے۔	۱۰۰
ایک طوق اگر اسے زبردستی پہنایا جاتا ہے تو دس زنجیریں از خود پہن لیتا ہے۔	۱۰۰
یہ خود پہنی ہوئی زنجیریں تقدس اور عقیدت کی رو سے تراشے ہوئے آقا ہیں۔	۱۰۰
یعنی مذہبی راہنماؤں اور علماء و مشائخ کی غلامی	۱۰۰
خلاصۂ بحث۔	۱۰۲

۶۔ رزاقیت ص ۱۰۳ تا ص ۱۲۶

مضمون	صفحہ
رزاقیت صفتِ ربوبیت کے اجمال کی ہی تفصیل ہے	۱۰۳
ہر وہ شے جو مبداءِ فیض کی طرف سے ملے رزق ہے۔	۱۰۳
اللہ نے زمین و آسمان میں رزقِ انسانی کے سرچشمے کھول رکھے ہیں	۱۰۳
نظامِ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔	۱۰۴
اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں، منکرین بھی اعتراف پر مجبور ہیں	۱۰۴
اللہ کے سوا کوئی رازقِ حقیقی نہیں۔	۱۰۵
جب رازق کوئی اور نہیں تو پھر غیر اللہ کی محتاجی کیسی!	۱۰۵
انسان کسی کے سامنے جھکتا اس وقت ہے جب اسے رزاق سمجھتا ہے۔	۱۰۶
اللہ سب کو رزق دیتا ہے اور خود کسی سے رزق کا خواہاں نہیں۔	۱۰۶
اس کے برعکس "خدایانِ باطل" دوسروں کو اس لئے دیتے ہیں کہ ان کی محنت سے اپنی مسرتوں کا سامان پیدا کریں۔	۱۰۶
رزق کی تعریف۔ رزق طیب۔ طیب سے خبیث کیسے بن جاتا ہے۔	۱۰۷
حلال و حرام کی تعیین کیسے ہوتی ہے۔	۱۰۸
مادہ پرست اور خدا پرست کے نظریہ میں فرق	۱۰۸
حلت و حرمت کا فیصلہ انسان خود نہیں کر سکتا بقیہ صفحہ ۹	۱۰۹

مضمون	صفحہ
مضر کا قیصت مریض نہیں بلکہ طبیب بھی کر سکتا ہے۔	
قوانین الٰہیہ کے اتباع سے رزق حسنہ اور عزت کی روزی ملتی ہے۔	۱۱۰
خدا کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کو بھی رزق طیب ملتا ہے۔	۱۱۰
ہجرت کے بعد جہاد کی منزل ہے۔ وہاں بھی رزق حسنہ ملتا ہے۔	۱۱۱
حکومت اور پھر حکومت الٰہیہ۔ رزق طیب کی بہترین شکل ہے۔	۱۱۲
اس حکومت کے قیام کی کوشش میں گھر بار چھوڑنے والوں اور جان دینے والوں کے لئے رزق طیب ہے یہاں بھی اور حیات اخروی میں بھی۔	۱۱۲
جنت میں رزق۔	۱۱۳
جور و استبداد رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جانے سے روا رکھا جاتا ہے۔	۱۱۳
بھوک اور افلاس خدا کا عذاب ہے۔	۱۱۳
یہ جور و استبداد کس صورت میں مٹ سکتا ہے؟	۱۱۴
رزق میں فضل خداوندی۔	۱۱۵
تنگی و فراخی رزق میں آزمائشیں۔	۱۱۵
نشۂ دولت کی بدمستیاں	۱۱۶
اللہ تعالیٰ اسی لئے توازن قائم رکھتا ہے۔	۱۱۷
ایمان و اعمال صالحہ سے رزق کریم ملتا ہے۔	۱۱۸
حصول رزق میں تلاش فضل۔	۱۱۹
افلاس کے ڈر سے قتل اولاد۔	۱۱۹
مادہ پرستی اور نظام معیشت	۱۲۰
مارکس — اشتراکیت کا علمبردار	۱۲۰
سوشلزم — اور — اسلامی سوشلزم۔	۱۲۱
انفاق فی سبیل اللہ	۱۲۲
ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے — کیسے!	۱۲۲
حکومت الٰہیہ میں اس آیۂ مقدسہ کی عملی تفاسیر۔	۱۲۳
حکومت الٰہیہ میں ربوبیت — اور محرومیت۔	۱۲۳
الحمد للہ رب العالمین کا عملی مفہوم	۱۲۳
بدنما فقر وجہ فخر ہے۔	۱۲۴
نظام معیشت۔	۱۲۵
معافی۔	۱۲۷
خدائے رحمٰن و رحیم۔	۱۲۸
نظام کائنات میں ابر رحمت کی گہرباریاں۔	۱۲۸
ہدایت آسمانی رحمت ہے۔	۱۳۱
لیکن کن کے لئے رحمت ہے؟	۱۳۲
نبوت خود نبی کے لئے بھی رحمت اور موہبت عظمیٰ ہے۔	۱۳۳
نبوت کا انتخاب مشیت سے ہے۔	۱۳۴
لیکن رسالت کے لئے نبی کے قلب مطہر کو تیار کیا جاتا ہے۔	۱۳۵
کتب آسمانی رحمت ہیں۔	۱۳۵
اب ان رحمتوں کا مجموعہ صرف قرآن کریم ہے۔	۱۳۶
لیکن کن کے لئے رحمت؟	۱۳۹
صراط مستقیم رحمت خداوندی ہے۔	۱۳۹
ابلیسانہ لغزشوں سے محفوظ رہنا خدا کی رحمت ہے۔	۱۴۰
شریعت میں خدا کی طرف سے آسانیاں ملنا رحمت ہے۔	۱۴۰
لیکن کسی انسان کو اختیار نہیں کہ قانون خداوندی کے نفاذ میں نرمی برتے۔	۱۴۱
قانون مکافات عمل رحمت ہے۔ (افراد اور اقوام دونوں کے لئے)	۱۴۱
مہلت کا زمانہ بھی رحمت ہے تاکہ توبہ کر لی جائے۔	۱۴۲
معافی مل جانا بھی رحمت ہے۔	۱۴۳
عذاب سے نجات مل جانا بھی رحمت ہے۔	۱۴۴
عذاب اخروی سے بھی۔	۱۴۶
جنت رحمت خداوندی ہے۔	۱۴۶
دین و دنیا کی سرفرازیاں۔	۱۴۷
اولاد صالحہ مشیت ایزدی کے ماتحت رحمت ہے۔	۱۴۸
معاملات کا سلجھتے جانا۔ اچھے رفقاء کار کا مل جانا رحمت ہے۔	۱۴۹
صالحین کی جماعت میں شامل ہو جانا بہت بڑی رحمت ہے۔	۱۴۹
حکومت الٰہیہ کا قیام رحمت ہے۔	۱۴۹
لیکن اس کا مستحق بننے کی کچھ شرائط بھی ہیں۔	۱۵۰
ملت واحدہ بن کر رہنا رحمت کا موجب ہے۔	۱۵۰
مخالفین کے مقابلہ کے لئے قوت کے سامان بھی رحمت ہیں۔	۱۵۱
رحمت خداوندی سے مایوسی کفر ہے۔	۱۵۲
دامان رحمت کی وسعتیں۔	۱۵۳

۷۔ رحمت صفحہ ۱۲۷ تا صفحہ ۱۵۳

مضمون	صفحہ
لیکن استحقاقِ رحمت کی شرائط بھی ہیں۔	۱۵۴
یعنی اطاعتِ قوانینِ الٰہیہ اور باہمی مودّت و ہم آہنگی۔ ہجرت اور جہاد — اور پھر مستقل مزاجی۔ ثابت قدمی۔	۱۵۵
اس سے کھوئی ہوئی عظمتیں پھر سے واپس آجاتی ہیں۔	۱۵۶
رحمتوں کے دگنے حصے ملتے ہیں۔ دنیا کی امامت کے لئے شمع نورانی عطا ہوجاتی ہے۔	۱۵۶
لیکن انسانی فطرت عجیب واقع ہوئی ہے۔	۱۵۸
رحمت کے لئے دعائیں۔	۱۵۸
خلاصۂ مبحث۔	۱۶۰
۸۔ انعام نعمت ص ۱۶۱ تا ص ۱۷۸	
صراط مستقیم منعم علیہ حضرات کی راہ ہے۔	۱۶۱
دین و دنیا کی نعمتیں۔	۱۶۲
نبوت نعمت ہے۔ شریعت بھی۔	۱۶۳
حضورؐ پر انعاماتِ خداوندی کی بارشیں۔	۱۶۴
تمام اقوامِ عالم پر برتری حاصل ہونا نعمت ہے۔	۱۶۵
ذرائع علم۔ سمع و بصر و قلبِ سلیم نعماءِ خداوندی ہیں۔	۱۶۵
سامانِ معیشت، [illegible]، محلات، اسبابِ قوت سب نعمتیں ہیں	۱۶۵
حکومت نعمتِ خداوندی ہے۔	۱۶۶
فتح و نصرت بھی نعمت ہے۔	۱۶۷
غلامی سے نجات ملنا نعمتِ الٰہی ہے۔	۱۶۸
مردہ قوم کی بازآفرینی۔	۱۶۸
اتحادِ ملی۔ وحدتِ امت۔ بہت بڑی نعمت ہے۔	۱۶۹
لغزشوں سے معافی مل جانا نعمت ہے۔	۱۶۹
جنت — بڑی نعمت۔	۱۶۹
نعمتیں زیادہ کس طرح ہوتی ہیں۔	۱۷۰
غیر خدا کے سامنے جھک جانا کفرانِ نعمت ہے۔	۱۷۱
لیڈروں کا کفرانِ نعمت، قوم کی ہلاکت کا موجب۔	۱۷۲
انسانی فطرت۔ نعمت ملنے پر انانیت اور چھن جانے پر مایوسی۔	۱۷۳
دونوں آزمائشیں۔	۱۷۴
نعمتیں کبھی نہیں چھینی جاتیں جب تک خود اس قوم کے اندر ضعفِ خودی نہیں پیدا ہوجاتا۔	۱۷۵
تحدیثِ نعمت۔	۱۷۵
خلاصۂ مبحث۔	۱۷۵
اصولِ تغیرِ نعمت کی تشریح۔	۱۷۶
۹۔ فضل ص ۱۷۹ تا ص ۱۹۷	
فضل کسے کہتے ہیں۔	۱۷۹
نبوت فضلِ ایزدی ہے۔	۱۷۹
قرآن اللہ کا فضل ہے۔	۱۸۰
صاحبِ قرآن صلعم کا اسوۂ حسنہ بھی فضلِ خداوندی ہے۔	۱۸۱
اس کتاب کا امت کو وراثتاً ملنا فضلِ کبیر ہے۔	۱۸۲
فطرتِ انسانی کے مطابق شریعت کا مل جانا بھی فضل ہے۔	۱۸۲
قرآن سے رشد و ہدایت کا حاصل ہوجانا فضلِ خداوندی ہے۔	۱۸۳
گمراہی سے بچ جانا بھی اس کا فضل ہے۔	۱۸۴
سعادتِ اخروی فضلِ الٰہی ہے۔	۱۸۴
یہ جہانِ تگ و دو فضلِ خداوندی ہے کہ اس میں انسانی خودی کے استحکام کے سامان میسر ہیں۔	۱۸۶
امتیازی زندگی اللہ کا فضل ہے۔	۱۸۶
قوتوں کا حاصل ہوجانا، صنعت و حرفت میں کمال پیدا ہوجانا — سب اللہ کے فضل سے ہیں۔	۱۸۷
فتح و نصرت، کامرانی و کامیابی۔	۱۸۷
یہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟	۱۸۸
قیامِ امن فضلِ خداوندی ہے۔	۱۸۹
فضل کا مستحق ہونے کی شرائط۔	۱۸۹
قانونِ مکافاتِ عمل میں مہلت کا وقفہ فضلِ خداوندی ہے تاکہ اس میں توبہ سے اپنی حالت کو بہتر بنا لیا جائے۔	۱۹۰
لغزشوں کا معاف ہوجانا بھی فضل ہے۔	۱۹۱
محنت سے زیادہ معاوضہ۔	۱۹۱
فضلِ خداوندی پر دوسروں سے حسد مت کرو، اس کا استحقاق پیدا کرو۔	۱۹۲
اعمال کے نتائج، محنتوں کے ثمرات سب خدا کے فضل سے مرتب ہوتے ہیں۔ تنہا انسانی ہنرمندی سے نہیں۔	۱۹۳
فضلِ ایزدی کی جستجو۔	۱۹۵

مضمون	صفحہ
فسق کیا ہے؟	۱۹۵
خلاصۂ بحث۔	۱۹۶

۱۰۔ منّ۔ احسان ص۱۹۸ تا ص۲۰۲

مضمون	صفحہ
معنی۔	۱۹۸
نبوت احسان خداوندی ہے۔	۱۹۹
دولت و حکومت بھی خدا کے احسانات میں سے ہیں۔	۱۹۹
غلامی سے نجات مل جانا احسان خداوندی ہے۔	۲۰۰
عذاب الٰہی سے محفوظ رہنا۔ احسان ہے۔	۲۰۱
ایمان کی دولت۔ احسان خداوندی ہے۔	۲۰۱
خلاصۂ بحث۔	۲۰۲

۱۱۔ غضب۔ عتاب ص۲۰۳ تا ص۲۱۰

مضمون	صفحہ
لعنت کے مقابلہ میں غضب۔	۲۰۳
غضب کا صحیح مفہوم کیا ہے۔	۲۰۴
خدا کے غضب اور انسانی غصہ میں فرق۔	۲۰۴
غضب۔ اعمالِ بد کے فطری نتائج کا نام ہے۔	۲۰۴
مغضوب علیہ۔ کون ہیں؟	۲۰۵
دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی اللہ کا غضب ہے۔	۲۰۶
قرآن کریم سے انکار غضب الٰہی کا موجب ہے۔	۲۰۶
نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل قوم مغضوب علیہ ہے۔	۲۰۷
باہمی عداوت اللہ کا غضب ہے۔	۲۰۷
میدانِ جنگ سے فرار۔ باعثِ غضب الٰہی ہے۔	۲۰۷
اس سے قوم غلامی کی شکار ہو جاتی ہے اور غلامی خدا کا غضب ہے	۲۰۸
جن پر اللہ کا غضب ہو ان سے دوستی جائز نہیں۔	۲۰۸
مومن اور مغضوب علیہ کی زندگی یکساں نہیں ہو سکتی۔	۲۰۹
خلاصۂ بحث۔	۲۰۹

۱۲۔ لعنت ص۲۱۱ تا ص۲۲۴

مضمون	صفحہ
لعنت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟	۲۱۱
یہ کوئی گالی نہیں۔ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔	۲۱۱
رحمت خداوندی سے دوری یا محرومی کا نام لعنت ہے۔	۲۱۲
لعنت اعمالِ بد کا فطری نتیجہ ہے۔	۲۱۳
لعنت کن اقوام پر برستی ہے۔	۲۱۳
خدا کے عہد کو توڑ دینا لعنت کا موجب ہے۔	۲۱۴
باہمی بغض و عداوت خدا کی لعنت ہے۔	۲۱۵
تلاعب بالدین (دین سے استہزاء وغیرہ) موجب لعنت	۲۱۶
قرآن پر ایمان نہ لانے سے لعنت۔	۲۱۶
ہدایت سے روگردانی۔ لعنت۔	۲۱۷
کتمانِ حقیقت سے لعنت۔	۲۱۹
سوسائٹی کے عیوب۔ بہتان تراشی موجب لعنت ہے مومنین کو ایذا دہی، خدا و رسولؐ کو ایذا دہی۔ اللہ کی رحمتوں سے دوری (لعنت) کا باعث ہے۔	۲۲۰
قتلِ مومن سے بڑا جرم باعثِ لعنت اور کیا ہوگا۔	۲۲۰
فساد یعنی قوانین الٰہیہ کے خلاف ہر نظام۔ لعنت ہے۔	۲۲۱
اور غلامی!!	۲۲۱
دنیا اور آخرت کی لعنت۔	۲۲۲
مذہبی تقلید موجب لعنت۔	۲۲۲
یہ تقلید قرآن کریم میں تدبر نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور قرآن میں عدم تدبر خود لعنت ہے۔	۲۲۳
خلاصۂ بحث	۲۲۴

۱۳۔ قہّار ص۲۲۵ تا ص۲۲۷

مضمون	صفحہ
قہر کا مفہوم کیا ہے؟	۲۲۵
ہر قسم کے اختیارات کا مالک۔	۲۲۶
دنیا و آخرت میں تمام قوتوں کا سرچشمہ۔	۲۲۷

۱۴۔ جبّار المتکبّر ص۲۲۸ تا ص۲۲۹

مضمون	صفحہ
جبار کے معنی۔ ہر بگڑی کو بنانے والا۔	۲۲۸
انسانوں جیسی سرکشی اور ظلم نہیں۔	۲۲۸
المتکبّر۔ جہانِ کبریائی کا مالک۔	۲۲۹

۱۵۔ المنتقم۔ ذو انتقام ص۲۳۰ تا ص۲۳۲

مضمون	صفحہ
انتقام کا صحیح مفہوم کیا ہے۔	۲۳۰

مضمون	صفحہ
خدا کی گرفت کیا ہے؟	۲۳۱

۱۶۔ علم صفحہ ۲۳۳ تا صفحہ ۲۵۷

مضمون	صفحہ
اللہ تعالیٰ کو کائنات کی ہر شے کا علم ہے	۲۳۳
ارض و سماوات کے ذرہ ذرہ کا عالم	۲۳۴
کارگہ کائنات کے ایک ایک پرزہ سے باخبر	۲۳۵
علم الٰہی پر ایمان انسانی زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔	۲۳۶
وہ تمام اعمال انسانی سے واقف ہے۔	۲۳۶
صرف محسوس اعمال ہی نہیں بلکہ دل کے ارادوں تک سے واقف	۲۳۷
خدا کے عالم ہونے کی فطری دلیل	۲۳۸
مادہ پرستوں کی غلط اندیشیاں	۲۳۹
منافقین کی خود فریبیاں	۲۳۹
وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کے بھیدوں سے واقف ہے۔	۲۴۰
ماضی و مستقبل، غیب و شہادت سب کا جاننے والا۔	۲۴۱
اللہ کے سوا علم غیب کسی کو نہیں۔	۲۴۳
حضرات انبیائے کرام کو بھی از خود علم غیب نہیں ہوتا۔	۲۴۵
نبی اکرمؐ بھی از خود غیب سے واقف نہ تھے۔	۲۴۶
اللہ بعض غیب کی باتیں رسولوں کو بتا دیتا ہے۔	۲۴۷
قصص قرآنی اور احوال و کوائف انبیائے سابقہ اسی ذیل میں آتے ہیں	۲۴۷
اور کسی کو علم غیب نہیں ہوتا۔	۲۴۸
معبودان باطل کو علم غیب نہیں ہوتا۔	۲۴۸
انسانوں کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔	۲۴۹
فرشتے بھی اتنا ہی جانتے ہیں جتنا انہیں بتایا گیا ہے۔	۲۴۹
ایک شبہ کا ازالہ	۲۵۰
جہاں اللہ نے فرمایا ہے کہ فلاں بات اس لئے کی تاکہ ہم جان لیں کہ .... اس "جاننے" سے کیا مفہوم ہے۔	
علیم و خبیر و سمیع و بصیر	۲۵۲
ان صفات پر ایمان کا عملی نتیجہ	۲۵۴
خلاصۂ مبحث۔	۲۵۶

۱۷۔ قدرت صفحہ ۲۵۷ تا صفحہ ۲۷۱

مضمون	صفحہ
قدرت کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے۔	۲۵۸
وہ قادر مطلق ہے۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانا یا اس کے بعد اس پر بھی قادر ہے کہ اس کے مثل اور بھی پیدا کر دے۔	۲۵۹
اس پر بھی قادر کہ نوع انسانی کو معدوم کر کے ان کی جگہ ایک جدید مخلوق لے آئے۔	۲۶۰
اس لئے کہ سرچشمۂ حیات پر اسی کا قبضہ ہے۔	۲۶۰
ایسے ہی قوانین قدرت اقوام و ملل پر بھی مسلط ہیں۔ اس لئے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے اسی کے قوانین کے ماتحت متعین ہوتے ہیں۔	۲۶۱
(لفظ آلاء کے معنی بھی نعمت کی نسبت۔ قدرت زیادہ موزوں ہیں)	۲۶۳
انسانی خودی کی تذلیل کی دو خطرناک گھاٹیاں دفع مضرت اور جلب منفعت۔	۲۶۴
دور جہالت کے انسان کے معبود جن سے وہ ڈرتا تھا یا جن سے امیدیں وابستہ کرتا تھا۔	۲۶۴
دور حاضرہ کے معبود — صرف اصطلاحات میں فرق۔	۲۶۴
ایمان مومن — نفع اور نقصان کی قوت اللہ کے سوا کسی میں نہیں۔	۲۶۵
معبودان باطل — "دیوی دیوتا" یا دور حاضر کے "آقا" کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتے۔	۲۶۶
انہیں "خدا" بنا لینا جوہر انسانیت سے محروم ہو جانا ہے۔	۲۶۷
اور ان سے منہ موڑ لینا خودی کا استحکام۔	۲۶۸
اس لئے مرد مومن اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔	۲۶۸
اور تو اور۔ نوع انسانی کی بلند ترین ہستی (جناب نبی اکرمؐ) بھی نفع و نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتے تھے۔	۲۶۹
جب حضورؐ کی یہ کیفیت تھی تو تا بدیگراں چہ رسد۔	۲۶۹
ایمان ابراہیمیؑ۔	۲۶۹
تمام اسباب و ذرائع سے گذر کر نگاہ مسبب الاسباب اور علت العلل پر جا کر ٹکے۔	۲۷۰
ایک اہم شبہ کا ازالہ۔ استعانت و تعاون میں فرق۔	۲۷۰
خدا پرست اور مادہ پرست کے زاویۂ نگاہ کا فرق۔	۲۷۱
خلاصۂ مبحث۔	۲۷۱

۱۸۔ عرش و کرسی صفحہ ۲۷۲ تا صفحہ ۲۸۰

مضمون	صفحہ
عرش و کرسی کے لغوی معنی۔	۲۷۲

صفحہ	مضمون
۲۷۳	عرش الٰہی سے مفہوم۔ حکومت وجلال اور اختیار و قدرت۔
۲۷۴	علو مرتبت اور رفعت مدارج تمام قوتوں کے سرچشمہ کا بلا شریک و سہیم مالک۔
۲۷۵	استوا علی العرش کے معنی۔
	محکم طریق پر کنٹرول و تسلط قائم رکھنا۔ نظم ونسق کی پختگی و استواری کی طرف التفات کرنا
۲۷۶	تدبیر امور اسی کے مرکز حکومت سے ہوتی ہے۔
۲۷۷	اس کا عرش پانی پر ہے۔ اس کی تشریح۔
۲۷۷	سرچشمۂ زندگی پر اسی کا قبضہ واختیار ہے۔
۲۷۹	"حاملین عرش" سے کیا مراد ہے۔
۲۷۹	خلاصۂ مبحث۔

۱۹ - ملکوت صفحہ ۲۸۱ تا صفحہ ۲۸۹

صفحہ	مضمون
۲۸۱	زمین و آسمان میں حکومت صرف اللہ کی ہے۔
۲۸۲	اس حکومت میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔
۲۸۳	اپنی مملکت میں ہر شے پر پورا پورا قبضہ واختیار اسے حاصل ہے۔
۲۸۴	خدا کے سوا لوگ جن کی معبودیت اختیار کر لیتے ہیں انہیں اس کی خدائی میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔
۲۸۴	انسان کی اسی زندگی میں ہی نہیں بلکہ حیات اخروی میں بھی اللہ ہی کی حکومت ہوگی۔
۲۸۵	دنیاوی حکومت و مملکت اسی کی عطا فرمودہ ہے۔
۲۸۶	شان کبریائی اسی کے لئے زیبا ہے۔
۲۸۶	خلاصۂ مبحث۔

۲۰ - احیاء و اماتت صفحہ ۲۸۷ تا صفحہ ۲۹۰

صفحہ	مضمون
۲۸۷	ہر شے کا مالک خدا، زندگی کا بخشندہ اور موت پر قادر ہے۔
۲۸۸	فطرتی دلیل کہ تم ایسے خدا سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟
۲۸۸	ایمان ابراہیمی
۲۸۸	سچی دلیل یعنی خدا کے سوا کسی اور کو موت وحیات پر اختیار حاصل نہیں
۲۸۹	موت حیات کے متعلق مادہ پرستوں کا نظریہ۔
۲۸۹	اس نظریہ کا ابطال۔
۲۹۰	ایمان اور مومن کی جرأت آفرینیاں۔

۲۱ - مشیت - تقدیر صفحہ ۲۹۱ تا صفحہ ۳۴۸

باب اول تمہید

صفحہ	مضمون
۲۹۱	مسئلہ کی اہمیت مسلم وغیر مسلم ارباب فکر ونظر کی توجہات کا مرکز۔
۲۹۱	عامیانہ مسلک۔ لیکن درحقیقت نظام تمدن انسانی کا نقطۂ ماسکہ
۲۹۲	مشرق ومغرب کے فلاسفروں کا مسلک۔
۲۹۳	جبریہ، قدریہ اور بین بین کے نظریات
۲۹۳	جمادات۔ نباتات۔ حیوانات کی زندگی میں جبر وقدر
۲۹۴	ارتقائی مدارج میں انسانی زندگی۔ قدریت کی جھلک
۲۹۵	لیکن جسے بظاہر قدر سمجھا جاتا ہے۔ گہرائی تک پہنچ کر وہ بھی جبر نظر آنے لگ جاتا ہے۔
۲۹۶	یہ جبر بھی سطحی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس انسانی کے متعلق معلومات ہنوز عالم طفولیت میں ہیں۔
۲۹۷	نفس انسانی۔ خارجی اثرات اور اختیار و ارادہ کے حدود۔
۲۹۷	اسلام ماحول کو بدل کر کس طرح خارجی اثرات کے جبر کو مبدل بہ اختیار کر دیتا ہے۔
۲۹۸	ہر شے کے مفید و مضر ہونے کا پیمانہ مشیت کے قوانین کے ماتحت متعین ہوتا ہے۔
	اسی پیمانہ کو قدر یا تقدیر کہتے ہیں۔
	"حیوانی زندگی" کے لئے الگ الگ پیمانے ہیں۔
	اسی طرح انسانی زندگی کے لئے جداگانہ پیمانے۔
	لیکن یا حیوانی زندگی کے پیمانے تقدیر کہلاتے ہیں۔
	انسانی زندگی کے پیمانے احکام خداوندی۔
	انسان تقدیر کا پابند نہیں احکام کا پابند ہے۔
۲۹۹	مرد مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ اپنی جد وجہد کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ کرتا ہے۔
	جتنی ہم آہنگی ہوگی۔ اتنی ہی اس کے اندر تبدیلی ہوتی جائے گی۔
	جیسی تبدیلی ہوگی اسی کے مطابق "تقدیر" وارد ہو جائے گی
۳۰۰	انسان کے ایک عمل میں مختلف عناصر جمع ہوتے ہیں۔
۳۰۰	انہی عناصر کے مطابق جبر وقدر کا فیصلہ ہوتا ہے۔
۳۰۱	کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں معاملہ میں اس کا اختیار کتنا ہے اور جبر کس قدر

مضمون	صفحہ
یہ امر صرف اللہ تعالیٰ ہی متعین کر سکتا ہے۔	۳۰۱
اسی لئے فرمایا کہ مغفرت و عذاب مشیت کے مطابق ہوتا ہے یعنی اس قانون کے ماتحت جو اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں عمل میں انسان کا اختیار کس قدر تھا اور جبر کس قدر۔	۳۰۱
جبر و قدر کے متعلق قرآن کریم کی آیات میں بظاہر (معاذ اللہ) تضاد کیوں معلوم ہوتا ہے۔	۳۰۱
اس ظاہری تضاد کی وجہ سے جبر و قدر کے الگ الگ مذہب پیدا ہو گئے۔	۳۰۱
فی الحقیقت تضاد کوئی نہیں۔	۳۰۲
توافق کی شکل۔	۳۰۲
اعتراض جب اللہ کو ہر معاملہ کا علم تھا تو اس نے انسان کو برائی کرنے سے روک کیوں نہ دیا۔	۳۰۳
جواب۔	۳۰۳
معصیت کی استطاعت کے باوجود اطاعت۔ یہی شرفِ انسانیت ہے	۳۰۴
سیرتِ انسانی کی تشکیل میں عقیدۂ تقدیر کا حصہ۔	۳۰۵
فتح و کامرانی پر تکبر اور شکست و ناکامی پر افسردگی نہیں ہوتی۔	۳۰۶
انسان کی ہر آرزو پوری کیوں نہیں ہوتی۔	۳۰۷
صحیح عقیدۂ تقدیر سے جنتِ ارضی۔	۳۰۸
قرنِ اولیٰ میں عقیدۂ تقدیر کا نتیجہ۔	۳۰۹
اور آج!	۳۰۹
قدامت پرست اور جدت پسند، دونوں طبقوں کی ہلاکت انگیز غلطی۔	۳۱۰
باب دوم	
قانونِ فطرت اور قانونِ مشیت کا فرق۔	۳۱۱
قانونِ فطرت کی کئی کڑیاں قانونِ مشیت سے جا ملتی ہیں۔	۳۱۲
اللہ تعالیٰ اپنے قوانین میں کسی کا محتاج نہیں۔ مشعلِ قرآنی کی روشنی میں حیاتِ انسانی کے مختلف گوشوں کا مطالعہ۔	۳۱۲
(۱) مصائب۔	۳۱۳
کوئی مصیبت مشیتِ ایزدی کے بغیر نہیں آ سکتی۔	۳۱۳
لیکن معاملات کا جس قدر حصہ سلسلۂ علت و اسباب کے تابع ہے ان میں مصائب انسانی اعمال کی بدولت آتی ہیں۔	۳۱۴
طرح اقوام کی مصائب بھی اسی قانون کے ماتحت مرتب ہوتی ہیں۔	۳۱۵
تغیرِ اقوام کے حالات میں تبدیلی۔	۳۱۶

مضمون	صفحہ
[illegible] مشیت کو دنیا میں کس طرح انسانوں کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔	۳۱۸
تکمیلِ مشیت میں جد و جہد کا نام اعمالِ صالحہ ہے۔	۳۱۹
قصۂ حضرت موسیٰؑ و فرعون میں مشیت کی کار فرمائی۔	۳۱۹
حضرت موسیٰؑ اور مردِ بزرگ کا واقعہ۔	۳۱۹
قصۂ حضرت یوسفؑ میں مشیت۔	۳۲۰
غزوۂ احد میں مشیت کی جلوہ فرمائی۔	۳۲۱
اتباعِ احکامِ خداوندی سے سرفرازی اور معصیت سے پستی۔	۳۲۱
سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور (ii) بھلائی اللہ کی طرف سے اور برائی تمہاری اپنی طرف سے۔ ان میں تطبیق کی کیا صورت ہے۔	۳۲۲
تقدیر کے معنی۔	۳۲۲
(۲) رزق۔	۳۲۳
رزق اللہ کے مقرر کردہ اندازے کے مطابق ملتا ہے۔	۳۲۶
عزت و عظمت بھی مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔	۳۲۶
حکومت بھی قانونِ مشیت کے تابع ہے۔	۳۲۷
ان چیزوں کے حصول کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہیے۔	۳۲۸
(۳) اقوامِ عالم کا عروج و زوال	۳۳۰
(۴) موت مقررہ اندازے کے مطابق۔	۳۳۱
اقوام کی موت و حیات۔	۳۳۲
جب موت معینہ وقت پر آ کر رہتی ہے تو پھر علاج معالجہ کیوں؟ بچوں کو یتیم اور سہاگنوں کو بیوہ بنانے والی موت میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ موت کی اندوہناک مصیبتیں کس نظام میں سامنے آتی ہیں؟	۳۳۳
(۵) تخلیق۔	
ہر شے قانونِ مشیت کے ماتحت پیدا ہوتی ہے۔	۳۳۴
حضرت یحییٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش۔	۳۳۶
خلق میں اضافہ۔	۳۳۶
احسن الخالقین سے مفہوم۔	۳۳۷
(۶) ہدایت و ضلالت	
سلسلۂ تقدیر کی سب سے اہم کڑی جس پر مذہب و اخلاق کی بنیادیں استوار ہیں۔	۳۳۸

مضمون	صفحہ
ہدایت اور ضلالت کے راستوں کی تمیز فطرت انسانی میں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔	۳۳۹
لیکن فطرت خارجی اثرات کے نیچے دب کر اس قوت تمیز کو کھو بیٹھتی ہے۔	۳۳۹
فطرت کی اسی قوت خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے ہدایت خداوندی نازل ہوتی ہے۔	۳۳۹
ذکر اور تذکرہ کے یہی معنی ہیں۔	۳۴۰
خدا نے تمام انسانوں کو ہدایت پر چلنے پر مجبور کیوں نہ کر دیا؟	۳۴۰
اس لئے کہ	۳۴۱
معجزات کے ذریعے ہدایت	۳۴۲
اب ہدایت قرآن کی روشنی میں عقل انسانی سے کام لینے سے حاصل ہوتی ہے۔	۳۴۴
قرآن کریم سے ہدایت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔	۳۴۵
ہدایت کی راہیں کن پر بند ہیں اور کیوں؟ فاسقین۔ منافقین۔ کفار۔	۳۴۶
ختم اللہ علی قلوبہم سے مفہوم کیا ہے۔ دلوں پر مہریں کیسے لگتی ہیں۔	۳۴۷
مہریں انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہیں جو قانون مشیت کے ماتحت مرتب ہوتا ہے۔	۳۵۴
اس فطری نتیجہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ جسے اللہ کا قانون مشیت گمراہ کر دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لا سکتا۔	۳۵۷
حالت زنگ آلودگی کے بعد بھی قرآن پر ایمان و تدبر ہدایت کی راہ دکھا دیتا ہے۔	۳۵۸
کتاب ہدیٰ کا پہلا ورق۔	۳۵۹
"جس پر اللہ راہ سعادت بند کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا" اس سے کیا مفہوم ہے۔	۳۶۰
ضلالت مقدر کیسے ہو جاتی ہے۔	۳۶۱
ہدایت دے دینا خود رسولؐ کے بھی حیطۂ اختیار میں نہیں ہوتا۔ اس کا فریضہ تبلیغ رسالت ہوتا ہے۔	۳۶۲
اذن الٰہی اور مشیت خداوندی۔	۳۶۳
تزکیۂ قلب اور قانون مشیت میں تعلق؟	۳۶۵
شیطان کیسے گمراہ کرتا ہے۔	۳۶۸
ہدایت و ضلالت انسان کے اپنے اختیار کی چیز ہے؟	۳۷۰
لیکن اس اختیار میں بہر حال جبر کے عناصر شامل ہیں۔	۳۷۰

مضمون	صفحہ
انسان کا "چاہنا" بھی قانون مشیت کے تابع ہے۔	۳۷۱
تو پھر انسان کی ذمہ داری کس حد تک ہے؟	۳۷۱
اس ذمہ داری کا تعین مشیت کے اندازے اور پیمانے ہی کر سکتے ہیں۔	۳۷۱
یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء سے کیا مفہوم ہے؟	۳۷۱
مشیت بے عملی کا بہانہ نہیں بن سکتی۔	۳۷۲
انسان کے ذمے کوشش اور احکام کی اتباع ہے۔	۳۷۳
خدا کی پسندیدہ راہ کے اختیار کرنے میں کوشش۔	۳۷۴
اس کی ناپسندیدہ روش کو چھوڑ دینے کی سعی۔	۲۷۴
خدا کی پسند اور ناپسند کی تفصیل قرآن کریم میں موجود ہے۔	
خاتمہ کلام۔	۳۷۴
عقیدۂ تقدیر کے اثرات۔	۳۷۶
عقیدۂ تقدیر کا ماحصل۔	۳۷۸
۲۲۔ دعا صفحہ ۳۷۹ تا صفحہ ۳۹۰	
مادہ پرست اور خدا پرست کی زندگی!	۳۷۹
دعا کیا ہے۔ طریق دعا کیا ہے۔	۳۸۰
کس وقت پکارو!	۳۸۱
خدا کے سوا کسی کو نہ پکارو۔	۳۸۱
جیتے جاگتے کو پکارو۔ حی و قیوم کو پکارو۔	۳۸۲
دعا اور کوشش میں علاقہ۔	۳۸۲
کن معاملات میں دعا مؤثر ہوتی ہے۔	۳۸۳
ہر دعا قبول کیوں نہیں ہو جاتی۔	۳۸۳
دعا اور حیات اجتماعیہ۔	۳۸۴
دعائیں جمع کے صیغے۔	۳۸۴
کیا دعا سے قسمت کا لکھا مٹ سکتا ہے؟	۳۸۷
دعا کا اثر نفس انسانی پر۔	۳۸۸
مصیبت کسے کہتے ہیں۔ اور یہ کیسے ٹل سکتی ہے۔	۳۸۸
نگاہ کی تبدیلی کا اثر۔	۳۸۹
۲۳۔ نصرت و استعانت صفحہ ۳۹۱ تا صفحہ ۴۱۲	
نصرت کیوں طلب کی جاتی ہے اور کس سے؟	

مضمون	صفحہ
حضرات انبیاء کرام کی استعانت کی دعائیں۔	۳۹۱
نبی اکرمؐ کی دعائیں۔ نبی کی تلقین مومنین سے کی گئی۔	۳۹۲
اللہ کی نصرت کیسے ملتی ہے؟	۳۹۳
جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔	۳۹۴
خدا کی مدد کس طرح کی جاتی ہے۔ خدا کن کی مدد کرتا ہے۔	۳۹۵
نصرت الٰہی۔ قوانین خداوندی کے تمکن کے لئے ہوتی ہے۔	۳۹۶
حضرات انبیاء کرامؑ کی نصرت۔	۳۹۸
نبی آخر الزماں صلعم کی نصرت و تائید۔	۳۹۹
انصار و مہاجرین کی نصرت۔	۴۰۰
یہ نصرت کیسے ملی؟	۴۰۰
نصرت ملنے کا نظام اور اس کا خاکہ۔	۴۰۱
صرف ضعف و ناتوانی میں ہی نہیں بلکہ قوت و کامرانی میں بھی نصرت الٰہی کی احتیاج۔	۴۰۲
جشن فتح و نصرت کا انوکھا طریق۔	۴۰۵
اللہ کے سوا کوئی مدد نہیں دے سکتا۔	۴۰۶
نصرت الٰہی سے محرومی!	۴۰۸
مومن ہمیشہ غالب رہیں گے	۴۰۹
معصیت سے نصرت نہیں مل سکتی۔	۴۱۱
مہلت کا وقفہ۔	۴۱۲
منافقین جنھیں خدا کی نصرت پر سچا ایمان نہیں ہوتا!	۴۱۳
مایوسی کی حالت۔	۴۱۴
آئینہ حقیقت! ہمارے خط و خال!	۴۱۴
صبر و صلوٰۃ سے استعانت!	۴۱۵
شیعت اور نصرت!	۴۱۶

۲۴ - توکل ص۴۱۷ تا ص۴۳۷

مضمون	صفحہ
توکل کے معنی۔	۴۱۷
توکل اور نصرت	۴۱۷
مومن کو اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے۔ منافق کو غیر اللہ پر۔	۴۱۸
توکل نہ رہے تو قلب پر شیطان کا غلبہ چھا جاتا ہے۔	۴۱۹
حضرات انبیاء کرامؑ کا توکل۔	۴۲۰
نبی اکرمؐ کی شان توکل۔	۴۲۲
وکیل کے معنی۔ وکالت کا مفہوم۔	۴۲۴
اللہ ہر شے پر وکیل ہے۔	۴۲۵
نگہبانی و پاسبانی صرف اللہ کی طلب کرو۔	۴۲۶
عجمی اور قرآنی توکل۔	۴۲۷
قرآنی توکل کیا ہے؟	۴۲۷
داستان بنی اسرائیل سے توکل کا صحیح مفہوم۔	۴۲۹
انسانی جد و جہد اور توکل	۴۳۰
صدر اولی کے مسلمان اور توکل۔	۴۳۱
توکل کا صحیح نظام۔	۴۳۲
توکل کی بے پناہ قوتیں۔	۴۳۳
ہجرت اور توکل۔	۴۳۴
خدائے زندہ و پائندہ پر توکل۔	۴۳۶
خلاصہ بحث۔	۴۳۷

۲۵ - ولایت ص۴۳۸ تا ص۴۶۳

مضمون	صفحہ
ولی کے معنی۔ مفہوم ثلاثہ۔	۴۳۸
وہ ولایت جو اللہ کے لئے مختص ہے۔	۴۳۹
اس کی ولایت کے بعد کسی اور کی کارسازی کی ضرورت نہیں رہتی۔	۴۴۱
ولایت خداوندی سے انکار کرنے والوں کا دنیا میں کوئی آسرا نہیں ہوتا۔	۴۴۲
شیطان کی ولایت!	۴۴۳
ولایت اور اطاعت خالص اللہ کے لئے۔	۴۴۵
خدا کے سوا کوئی اور ولی نہیں یعنی اس کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں۔	۴۴۶
اولیاء اللہ کون ہیں۔	۴۴۷
اولیاء اللہ کی پہچان کے طریقے۔	۴۴۸
اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطٰن۔	۴۴۸
ان دونوں کے باہمی تعلق؟	۴۴۸
غیر مسلموں سے دوستداری کے تعلقات۔	۴۴۹
کفار۔ یہود و نصاریٰ۔ منافقین سے تعلقات!	۴۵۰
اپنے کون ہیں؟	۴۵۲
ولایت خداوندی کے مواقع۔ حق و باطل کی کشمکش۔	۴۵۳

مضمون	صفحہ
...شرکا اٹل قانون ہے کہ کفار کے مقابلہ میں مومنین غالب رہیں گے	۴۵۶
...لی اللہ کی پہچان۔	۴۵۷
...ولا کون ہے۔	۴۵۸
...ہر کس کا ولی بنتا ہے۔	۴۵۹
اور کیوں بنتا ہے؟	۴۵۹
...چند متفرق معانی)	۴۶۰
...لاصۂ بحث۔	۴۶۰
...تعلقات کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ۔	۴۶۱
...دو زندگی میں جائز و ناجائز کی حدود کا تعین کیسے کیا جائیگا؟	۴۶۲
...یابی اور ناکامی کسے کہتے ہیں۔	۴۶۳
۲۶- درِ منثور صفحہ ۴۶۴ تا صفحہ [illegible] (متفرق صفاتِ خداوندی)	
۔ الحکیم	۴۶۴
۔ الحلیم	۴۶۴
۵- الغفور۔ الغفار۔ العفو۔	۴۶۵
۔ التواب	۴۶۶
۔ الرؤف۔	۴۶۷
۔ الودود۔	۴۶۷
۔ الکریم	۴۶۸
۔ البرّ	۴۶۹
۔ الحفیظ۔ الرقیب۔ المہیمن۔ الحی۔ القیوم۔ المقیت	۴۷۰
۔ ازلی و ابدی۔ (الاول۔ الاخر۔ الظاہر۔ الباطن)	۴۷۰
۔ القریب۔	۴۷۱
۔ اللطیف۔	۴۷۱
۔ الشہید۔	۴۷۲
۔ الحسیب	۴۷۳
۔ الشاکر۔ الشکور۔	۴۷۵
۔ السلام۔ المومن۔	۴۷۶
خدا سلامتی کی طرف دعوت دیتا ہے۔	۴۷۶
یہ دعوت قرآن کریم کے ذریعے ملتی ہے۔	۴۷۶
نظام اسلامی میں امن و سلامتی کے مستقر	۴۷۷

مضمون	صفحہ
برگزیدہ انسانوں کو سلامتی کی بشارتیں۔	۴۷۷
جنت میں سلامتی۔	۴۷۸
اسلامی معاشرت میں امن و سلامتی کا تہدیہ۔	۴۷۹
۱۹- الاعلیٰ۔ العظیم۔ العلی۔ المتعال۔	۴۸۱
حقیقی علو مرتبت کس کے لئے ہے۔	۴۸۳
۲۰- المتین۔ العزیز۔	۴۸۳
حقیقی عزت کسے حق ہے اور کیسے؟	۴۸۴
غیروں کے ہاں عزت کے متلاشی!	۴۸۵
مومن اور عزت۔	۴۸۶
۲۱- البارئ۔ المصوّر۔	۴۸۷
۲۲- الواسع۔	۴۸۸
اس کی بخشش و عنایات کی بے پایاں وسعتیں۔	۴۸۹
۲۳- الوھاب۔	۴۹۰
۲۴- الغنی۔	۴۹۱
اللہ انسانی عبادت و انفاق سے بے نیاز ہے۔	۴۹۱
یہ سب انسان کے اپنے فائدے کے لئے ہیں۔	۴۹۱
اللہ تعالیٰ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔	۴۹۵
۲۵- الفتاح۔	۴۹۵
فتح کا اسلامی مفہوم۔ حق و باطل میں تمیز۔	۴۹۵
قرآن قولِ فیصل ہے۔	۴۹۶
۲۶- الحق۔	۴۹۷
حق کسے کہتے ہیں؟	۴۹۷
دین الحق کیا ہے؟	۴۹۸
۲۷- حمیدٌ مجیدٌ۔	۴۹۹
حمد و ستائش کا سزاوار۔	۵۰۰
حضرات انبیاء کرامؑ کے نغماتِ تحمید و تقدیس۔	۵۰۱
قانونِ مکافات کس طرح مستوجب حمد و ستائش ہے۔	۵۰۱
سفرِ زندگی کے آغاز و انجام میں زمزمۂ تحمید۔	۵۰۳
غلام اور آزاد!	۵۰۴
حمد و ستائش کی راہ۔	۵۰۴
مقامِ محمود۔	۵۰۴
اور اس تک رسائی!	۵۰۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	۲۸ - ذکر اللہ صفحہ ۵۱۸ تا صفحہ ۵۲۰		**۲۵ - تسبیح -**
۵۱۸	**لا الٰہ الا اللہ** — ایک حقیقی نعرۂ انقلاب !	۵۰۵	زمین و آسمان اور دیگر اشیاء کے فطرت کی تسبیح سے کیا مفہوم ہے -
۵۱۹	ایک طرف — انکار - بغاوت - سرکشی - تخریب - دوسری طرف اقرار - اطاعت - تسلیم - تعمیر - یہ کس سے اور وہ کس سے ؟	۵۰۶	تسبیح و تحمید میں باہمی رابط -
	شرک — انسانیت کی تذلیل - خودی کی شکست	۵۰۸	انسانوں کی تسبیح -
۵۱۹	ہر غیر خدائی نظامِ زندگی کی اطاعت -	۵۰۹	مردِ مومن کی تسبیح -
۵۱۹	حاکم و محکوم - دونوں غلام !	۵۱۱	**۲۶ - سبحان اللہ -**
۵۱۹	ذاتِ خداوندی کے متعلق ہم کس قدر جان سکتے ہیں ؟	۵۱۳	بطورِ اعترافِ عجز -
۵۲۰	اسلام کیا ہے ؟	۵۱۴	شانِ حسنہ بخشنہ -
۵۲۰	تجسسِ انسانی کا منتہیٰ -	۵۱۴	صفاتِ خداوندی پر ایمان کا عملی نتیجہ -
۵۲۰	ہادی کی ضرورت -	۵۱۵	ایک اہم نکتہ تفہیم قرآن کا نظم -
۵۲۰	بانگِ جرس -		**۲۷ - پیرایۂ مجاز -** صفحہ ۵۱۶ تا صفحہ ۵۱۷
۵۲۰	نشانِ منزل -	۵۱۶	اللہ کی طرف بعض ایسے الفاظ کی نسبت جو انسانی اعضاء پر دلالت کرتے ہیں -
۵۲۰	ذکر اللہ کا اعلانِ حقیقت -		
۵۲۰	قرآن اور حاملِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام -	۵۱۶	ان الفاظ کا صحیح مفہوم - وجہ - ید - عینین -

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ
أَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ ۱۸/۱۰۹

کہو کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائیگا
مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی - اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کر دیں
جب بھی وہ کفایت نہ کریں !